نگارشاتِ اعجاز

عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ
کی
کم یافتہ و نادر قدیم وجدید اور بعض غیر مطبوعہ تحریروں کا مجموعہ

ناشر

مولانا اعجاز احمد اعظمی لائبریری

نگارشاتِ اعجاز

عارف باللہ حضرت مولانا

اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ

کی

کم یافتہ و نادر قدیم و جدید اور بعض غیر مطبوعہ

تحریروں کا مجموعہ

ناشر

مولانا اعجاز احمد اعظمی لائبریری

تفصیلات

نام کتاب : نگارشاتِ اعجاز
تالیف : عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی
تدوین : محمد عرفات اعجاز اعظمی
صفحات : ۱۱۰
سنہ طباعت : فروری ۲۰۱۸ء
نوعیت : برقی
ناشر : مولانا اعجاز احمد اعظمی لائبریری
سرورق : مولانا وسیم الحق قاسمی بھیروی
رابطہ : 9936029463
ای میل : arfatazmi89@gmail.com

انتساب

مولانا اعظمی کے استاذ گرامی

حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہرؔ قاسمی

کے نام

ان کے اس شعر کے ساتھ:

ہجومِ غم سے جو گھبرائے زندگی کیا ہے
نہ پائے لذتِ غم وہ بھی آدمی کیا ہے
جو کانپ جائے اندھیروں سے روشنی کیا ہے
جو مرمٹے نہ کسی پہ تو عشق ہی کیا ہے
دیا ہے سیلِ حوادث کو راستہ میں نے
عطا کیا ہے زمانے کو حوصلہ میں نے

جوہر قاسمی

مشمولات

○مُقدِّمۃ مفتی محمد روح اللہ قاسمی صاحب ۷

مقالات:

۱۔ حرص دنیا کا انجام ۱۲
۲۔ انسان کو اپنے عیوب کا کیسے علم ہو؟ ۱۵
۲۔ اجتماعی معاشرہ کے تین ضروری باتیں: تواضع، تحمل، تامل ۱۹
۳۔ خطبہ صدارت: اختتامی اجلاس شعبہ مناظرہ دارالعلوم دیوبند ۲۱

شخصیات:

۴۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی ۳۱
۵۔ ایمان وروحانیت کا اختر تاباں: حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب ۳۸
۶۔ ایک پیکر وفا کی جدائی: مولانا محمد فاروق صاحب حیدرآباد ۵۳
۷۔ مولوی ثناء اللہ مرحوم ۶۶
۸۔ حافظ محمد عیسیٰ صاحب علیہ الرحمہ ۶۹
۹۔ اہلیہ جناب کلیم عاجز صاحب پٹنہ ۷۶

تقریظات:

۱۰۔ پیش لفظ [درد ودرماں] ۷۷
۱۱۔ پیش لفظ [شراب ایک زہر قاتل] ۸۵

۱۲۔ مقدمہ [زمزمہ انقلاب] ۸۷

۱۳۔ خطباتِ نبوی: از مولانا حبیب الرحمان ندوی ۸۹

۱۴۔ تقریظ [نرالا مجدد] ۹۸

۱۵۔ مقدمہ [مومن کامل: قرآن وحدیث کی روشنی میں] ۱۰۱

۱۶۔ سخن ہائے گفتنی [دین فطرت: آپ کے مسائل اور ان کا حل] ۱۰۴

۱۷۔ فہرست تالیفات، مکتوبات، خطبات، رسائل وتراجم
مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ ۱۰۸

❑❑❑

مُقَدِّمَہ

مولانا مفتی محمد روح اللہ قاسمی صاحب
استاذ: مدرسہ فلاح المسلمین بھوارہ مدھوبنی

استاذ گرامی عارف باللہ حضرت مولانا **اعجاز احمد اعظمی** رحمۃ اللہ علیہ دورِ حاضر کی عبقری شخصیت تھے۔ اللہ رب العزت نے انھیں گوناگوں کمالات اور خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ ہرفن مولا تھے۔ جس میدان میں بھی قدم رکھا اس کے شہسواروں میں نظر آئے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ علم وعمل کے منتہا پر ہوں، مگر جس فیاضی کے ساتھ وہ باطنی خوبیوں سے نوازے گئے تھے کم لوگوں میں اس طرح کی شان نظر آتی ہے۔ وہ نابغہ روزگار تھے۔ قدرت نے انھیں مجموعہ کمالات بنایا تھا۔ وہ جس شکل میں نظر آئے، کامل نظر آئے۔ استاذی میں تو وہ اپنی مثال آپ تھے اور ایک دنیا کو اس کا اعتراف بھی ہے۔ ہم نے انھیں ایک شاگرد کی شکل میں بھی دیکھا ہے، ایک باپ اور ایک بیٹے کی شکل میں بھی نظر آئے، ایک دوست کی حیثیت سے بھی ان پر نگاہ پڑی ہے، ایک مدبر وذمہ دار اور ایک مربی کی صورت میں بھی انھیں دیکھتا رہا، رشد وہدایت کی پیکری میں بھی مشاہدہ کا موقع ملتا رہا، جمال کے ساتھ جلال کی تصویر بھی نظروں کے سامنے ہے۔ جس رنگ میں نظر آئے بے مثال نظر آئے۔ ہمیشہ ''...... جا ایں جا است'' کا نظارہ ہوتا رہا۔ ان کے تلامذہ صرف انھیں کے تلامذہ نہیں ہیں، سبھوں کو اوروں سے بھی سیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ہر ایک کی اپنی شان، سبھی قابلِ فخر، ہر کوئی سر آنکھوں پر، ہر ایک کے لیے دیدہ ودل فرش راہ۔ لیکن اگر ان تلامذہ کی زبان پر عام طور سے صرف ایک ہی نام آتا ہے تو کچھ بات تو ہے جو بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر۔

تحریر وخطابت ہی کو لیجیے۔ بولتے تو ایسی سادگی کہ ہر کسی کے فہم وادراک سے قریب تر

اور ایسا پر اثر کہ دلوں کو جھنجھوڑ دے۔ لکھتے تو علمی مواد اور مضبوط استدلال کے ساتھ انتہائی رواں و خوبصورت اور لسانی خوبیوں سے مالا مال۔ الفاظ و تعبیرات اور تشبیہات و استعارات ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے اور بے تکلف اس کا استعمال ہوتا چلا جاتا۔ اور اس طرح فطری طرزِ تحریر اور اس کی سادگی و سہولت سے ایک سماں بندھ جاتا اور یوں محسوس ہوتا کہ تحریر صنائع و محاسن سے آراستہ ہو کر قوس وقزح کا نمونہ پیش کر رہی ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر سطر سطر سے اِذعان و یقین اور خلوص و وفا کا وہ اظہار ہوتا جو قاری کو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ لیتا۔

ہر طرح کی تحریریں لکھی ہیں، تحقیقی بھی اور قلم برداشتہ بھی۔ ان میں موعظت و نصیحت بھی ہے، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی جدوجہد بھی، سفرنامے بھی تنقید و تبصرہ بھی، آپ بیتی بھی جگ بیتی بھی اور خالص علمی موضوعات پر لکھے جانے والے خشک مضامین بھی۔ ایک ایک تحریر پڑھ جائیں، پورا کیے بغیر چارۂ کار نہیں۔ اکتاہٹ اور بے کیفی کیا معنی؟ بعض تحریریں تو بار بار پڑھ کر بھی سیری نہیں ہوتی۔ ان تحریروں میں زبان و ادب کے چٹخاروں کے ساتھ لفظ لفظ سے لکھنے والے کے اپنے مافی الضمیر پر خود اعتمادی کی جو شان جھلکتی ہے وہ دل و دماغ پر اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ذوق وجدان کے اختلاف کی بنا پر ہوسکتا ہے کہ آپ کو حاصل شدہ نتائج سے اختلاف ہو یا ممکن ہے کہ تحریر کی مشمولات سے آپ اتفاق نہیں رکھتے ہوں، مگر حضرت مولانا کی تحریروں کو پڑھ کر یہ اثر لیے بغیر آپ نہیں رہ سکتے کہ ان کے ایک ایک لفظ سے یقین اور اخلاص مترشح ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں سے اسلاف کی روایات پر خود اعتمادی صاف جھلکتی ہے۔ اس سے سرِ مو انحراف انھیں گوارہ نہیں تھا بلکہ یہ تو ان کا طرۂ امتیاز تھا کہ وہ اسلاف کی روایات پر سختی سے نہ صرف عامل تھے بلکہ بلا کسی خوف لومۃِ لائم اس کے داعی و مبلغ تھے۔

یوں تو حضرت مولانا کی چھوٹی بڑی تصنیف و تالیف کی ایک لمبی فہرست ہے اور اکثر زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکی ہے۔ اداریوں اور موقع بموقع لکھے گئے مقالات و مضامین اس کے سوا ہیں۔ اور اس کے بھی کئی ضخیم اور قیمتی مجموعے 'کھوئے ہوؤں کی جستجو'، 'تہجد گذار بندے'، 'حدیثِ دردِ دل' اور 'حدیثِ دوستاں' وغیرہ کے ناموں سے حضرت مولانا کی زندگی میں ہی منظر عام پر آچکے ہیں۔ حال ہی میں ہزار صفحات سے زاید پر مشتمل ایک اور مجموعہ ''علوم و نکات'' کے نام سے

دو جلدوں میں شائع ہو کر اصحابِ ذوق سے دادِ تحسین وصول کر چکا ہے۔ اللہ تعالی نے حضرت مولانا کی عمر میں بہت برکت رکھی تھی، کم وقت میں ڈھیر سارے کام ان سے لیے۔ اور اب ان کی وفات کے بعد ان کے خلف الصدق صاحبزادوں کو والد بزرگوار کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق بخشی ہے۔ چنانچہ ان کے علمی و عملی مشن کو ان لوگوں نے بخوبی سنبھالا ہے اور حضرت مولانا کے سابق الذکر مجموعہ کے علاوہ بھی کئی اور کاموں کو آگے بڑھا کر علمی دنیا کو بیش قیمت سوغات پیش کر چکے ہیں۔

یہ کتاب بھی دراصل مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے، جس میں مختلف نوع کے مضامین ہیں۔ بعض شخصیات پر ہیں، بعض کتابوں کے مقدمے اور تقریظات ہیں تو بعض دوسری نوعیت کے ہیں۔ اور اسی تنوع ورنگارنگی نے اس کتاب کو چار چاند لگایا ہے۔ اس کتاب میں بھی وہ تمام خوبیاں ملیں گی جو حضرت مولانا کی تحریر کا خاصہ ہے۔ اتفاق ہے کہ اس کتاب میں تحریر کے ساتھ تقریر و خطابت کا بھی ایک نمونہ موجود ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے کہنے والے کی نرم گفتاری وشیریں بیانی، مطالعہ کی وسعت، بات کہنے کا سلیقہ اور جادہ حق پر استقامت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ مناظرہ کے اختتامی اجلاس میں طلبہ دارالعلوم کو خطاب فرما رہے ہیں۔ یہ وہ شعبہ ہے جس میں اسلامی وغیر اسلامی جماعتوں اور فرقوں کے سامنے اپنے موقف کو واضح انداز میں رکھنے اور ان کی غلطیوں اور استدلال کی کمزوریوں پر انھیں متنبہ کرنے کا طریقہ سکھایا جاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> ’’ایک بات کا اور آپ کو دھیان بطور خاص رکھنا ہے۔ وہ یہ کہ آپ کے مقابلہ میں دو طرح کے لوگ آئیں گے۔ بعض تو وہ ہوں گے جو حق کے مقابلہ میں باطل کو لائیں گے، اسلام کے مقابلہ میں کفر کو پیش کریں گے۔ ہدایت سے ضلالت کو ٹکرائیں گے۔ یہ لوگ اسلامی تعلیمات پر اعتراض بھی کریں گے اور اپنے باطل مذہب کی تائید بھی کریں گے۔ ان کے مقابلے میں تو آپ کو کوئی نرمی اور مداہنت نہیں کرنی ہے۔ کفر وشرک تو قطعی باطل اور بلا ریب غلط نظریہ ہے، اس سے مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔‘‘ (ص: ۲۵)

تھوڑا آگے فرماتے ہیں:

> ’’دوسرے وہ جن سے ایمان وکفر کا اختلاف نہیں ہے۔ وہ آپ کے حق کے مقابلہ میں

باطل اور اسلام کے مقابلہ میں کفر وشرک نہیں لاتے؛ لیکن ان سے تاویل وتوجیہ کا اختلاف ہوتا ہے۔ عمل کے دو پہلو میں کسی ایک پہلو کی ترجیح کا اختلاف ہوتا ہے۔'' (ص:۲۶)

پھر اس بات کی وضاحت اور ان فرقوں کی نشاندہی کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

'' ان فرقوں سے گفتگو کرنے میں وہ رویہ نہیں اختیار کیا جانا چاہیے جو مطلق باطل کے مقابلہ میں کیا جاتا ہے۔ ان سے مناظرہ کرنے میں حکمت اور موعظتِ حسنہ کی بڑی ضرورت ہے۔ ان کے مقابلہ میں جو صدق وصواب ہے اسے واضح کردینا ضروری ہے اور تاویلات و توجیہات میں جہاں جہاں غلطی ہو یا تاویل تحریف کے اندر داخل ہوگئی ہو، اسے دلائل سے بیان کردینا چاہیے۔ لیکن یہ چیز بقدرِ ضرورت ہو، پوری زندگی پر یہ موضوع چھا جائے، کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔'' (ص:۲۸)

تحریر کا بھی ایک نمونہ دیکھتے چلیے۔ امت کی زبوں حالی کی تصویر کشی اور اس کے اسباب اور علاج کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

'' قرآن کی آیات اور احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں بلاخوفِ تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ دنیا کے حالات میں جو تغیرات رونما ہوتے ہیں، خواہ حوادث کے کوہِ گراں ٹوٹ رہے ہوں، طوفانِ بلا کی موجیں اٹھ رہی ہوں، سیلاب وطغیانی کی تباہ کاریاں ہوں، زمینی وآسمانی آفات کا نزول ہو، قحط سالی اور امساکِ باراں کی ہولناکیاں مخلوق کو بے تاب کیے ہوں، قتل وغارت گری کے واقعات سکونِ عالم کو درہم برہم کررہے ہوں، فجائی وناگہانی موتیں سامانِ عبرت بن رہی ہوں، جان ومال کی تباہی قلوب پر خوف وہراس مسلط کیے ہوں، آتش زدگی اور غرقابی کی رفتار تیز ہورہی ہو یا زلزلے اور بادوباراں کے جھونکے نظامِ عالم کو متاثر کررہے ہوں۔ یہ اور اس جیسی بے شمار بلائیں بلاشبہ انسانوں کے اعمالِ بد کے نتائج اور غضب خداوندی کے مظہر ہیں۔'' (ص: ۷۸)

ان ناگہانی حالات وآفات کے موقعوں سے خود احتسابی کے بجائے ہر کوئی اس کا سارا ٹھیکرا دوسروں کے سر پھوڑنا چاہتا ہے۔ اور تماشہ یہ کہ وہ بھی ان تاریک گلیوں کی خاک چھان رہے ہیں جن کے پاس وحی کی صحیح وسچی اور تابناک روشنی ہے۔ صحیح رخ پر چلنے کے بجائے

اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد انسان کے ہاتھ کیا آتا ہے؟ سنیے:

> ”تلاش و جستجو درحقیقت اپنے اصل مرکز سے بہت دور ہٹ کر ہوتی ہے۔ یہ نگاہیں سراب کے پیچھے دوڑتی ہیں اور اصل مقصد کا سراغ کسی کو نہیں ملتا۔ ڈال پات کو سینچنے والے جڑوں کو فراموش کر کے باغ و بہار کی جستجو میں حیران ہیں؛ لیکن چمن ہے کہ خشک ہوتا جارہا ہے اور یہ سر پیٹ رہے ہیں کہ ہائے! ہماری تمام تر کاوش ناکام ہوتی جارہی ہے۔ انسان اپنے علم کی نارسائی کا ایسا دردناک منظر دیکھ رہا ہے؛ لیکن اس پر بھی وہ صحیح راہ چھوڑ کر غلط اور تنگ و تاریک وادیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔“ (ص:۷۹)

کتاب کے اس حصہ کو بطور خاص پڑھیے۔ اس میں جہاں کہنے والے کا درد و کڑھن اور امت کے حالات پر بے چینی ہویدا ہے، وہیں خالقِ ارض و سماوات کے احکام پر غیر متزلزل یقین کی پھوار برستی نظر آتی ہے۔ اسی کے ساتھ جملوں کا جو تسلسل، کلام کی روانی، زبان کی چاشنی اور ادب کی جلوہ گری ہے وہ مزید برآں۔

محمد روح اللہ قاسمی
مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر بھوارہ مدھوبنی

* * *

حرصِ دُنیا کا انجام

قرآن پاک میں سورہ اعراف کی آیت ۵ے۱ور ۶ے۱کی تلاوت کیجیے اوراس کے معنی و مطلب پرغور کیجیے۔

وَاتْـلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِیْ آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْـغَـاوِيْـنَ ، وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْـكَـلْـبِ إِنْ تَـحْـمِـلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِکَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيَاتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ.

ترجمہ: اوران کواس شخص کا حال سنادو جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں، پھر وہ ان کو چھوڑ نکلا، پھراس کے پیچھے شیطان لگ گیا تو وہ گمراہوں کی صف میں چلا گیا۔ اوراگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کی بدولت اس کا رُتبہ بلند کرتے، لیکن وہ تو زمین کا ہور ہا اور اپنی خواہش کے پیچھے چل نکلا۔ تو اس کا حال ایسا ہے جیسے کتا، اس پر تم بوجھ لا دو تب بھی ہانپتا ہے اور چھوڑ دو تب بھی ہانپتا ہے۔ یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ تو یہ احوال بیان کردو، تا کہ وہ غور کریں۔

ان دونوں آیتوں میں ایک ایسے شخص کا حال بیان کیا گیا ہے جو صاحبِ علم تھا، صاحبِ معرفت تھا، صاحبِ تصرف تھا، مستجاب الدعوات تھا، عبادت گزار تھا، اسم اعظم جانتا تھا۔ وہ اپنے علم وفضل، عبادت وریاضت اور قبولیتِ دعا وکرامت کی وجہ سے بڑا رُتبہ رکھتا تھا، مگر ایک کمزوری اس کے اندر تھی، اس کمزوری کو دور نہ کرسکا، اس کی وجہ سے اس کا سارا علم، سارا زُہد وتقویٰ، ساری عبادت وریاضت اور ساری کرامت ملیامیٹ ہو کر رہ گئی۔ وہ کمزوری کیا تھی؟ حرصِ دنیا اور نفس پروری!

اللہ کے دیے ہوئے علم کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اللہ کی رضا جوئی کے خاطر دولتِ دنیا کی

طرف نگاہ نہ اُٹھاتا، اسے اہمیت نہ دیتا۔ اللہ کو چاہنے والا دنیا سے بے رغبت ہوتا ہے، دنیا اس کے دامن سے الجھتی ہے، وہ اسے جھٹک کر آگے نکل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً اللہ والے خالی ہاتھ ہوتے ہیں، اگر ان کے ہاتھ میں مال آتا ہے تو وہ جلد اس سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انبیا علیھم السلام کا حال تو یہ ہوا کہ مال گھر میں ہو اور رات گزر جائے، گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کا حال اور ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ 'قل ما عند اللہ خیرٌ من اللھو و من التجارۃ' (جمعہ:۱۱) جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشا سے بھی اور خرید و فروخت سے بھی کہیں بہتر ہے۔ ان کے سامنے آخرت کا نقشہ ہمہ وقت رہتا تھا۔ یہی حال ان کے پیرووں کا بھی رہا۔ صحابہ کرام سے لے کر ہمارے دور تک جتنے اہل اللہ ہیں، سب کا دنیا اور متاعِ دنیا کے باب میں یہی حال رہا ہے، اور ہے۔ اگر کوئی شخص الٰہی علم رکھتا ہے تو اس کے دل کا حال یہی ہونا چاہیے۔ لیکن اس علم و معرفت کے ہوتے ہوئے، جب دنیا کی حرص اور نفس کی خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے تو آدمی اس علم کے حصار سے باہر آجاتا ہے۔ علم ہٹ جاتا ہے اور حرص رہ جاتی ہے۔ پھر جو بلند مرتبہ اسے حاصل تھا یا اس علم کی بدولت حاصل ہوسکتا تھا، اس سے بہت نیچے گر جاتا ہے، نہایت ذلیل و خوار ہو کر مال داروں اور دولت مندوں کے سامنے کتوں کی طرح ذلیل ہوتا ہے۔

امام دارمی نے اپنی کتاب ''مسند دارمی'' میں حضرت عبیداللہ بن عمر کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے۔ حضرت عبیداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ: 'امیر المومنین سیدنا عمر فاروقؓ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے دریافت فرمایا کہ ''من أرباب العلم؟'' اہل علم کون لوگ ہیں؟ انھوں نے فرمایا ''الذین یعملون بما یعلمون'' وہ لوگ جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ پوچھا ''فما ینفی العلم من صدور الرجال ؟'' لوگوں کے سینے سے کون سی چیز علم کو نکال دیتی ہے؟ فرمایا ''الطمع'' حرص۔ (باب صیانۃ العلم)

یہ حرصِ دنیا ایسی ہی بلا ہے۔ حدیث میں وارد ہے: ''الحریص محروم'' حریص محروم ہی ہوتا ہے۔ علمِ دین کا وہ مرتبہ ہے کہ اس کے واسطے سے دنیا و آخرت کی بڑی رفعتیں حاصل ہوتی ہیں لیکن آدمی جب اس کی ناقدری کرتا ہے تو اتنا ہی نیچے گرتا ہے۔

امام ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ: 'اگر اہلِ علم علم کی

حفاظت کرتے اور اسے ان لوگوں کے پاس رکھتے جو اس کے اہل ہیں تو اس کی وجہ سے زمانے کے سردار ہوتے۔ لیکن اسے ان لوگوں نے دنیاداروں کے لیے استعمال کیا تو ہلکے ہو کر رہ گئے۔ میں نے تمھارے نبی ﷺ سے سنا ہے۔ آپ ﷺ فرماتے تھے کہ: ’جس نے تمام فکروں کی ایک فکر بنالی ہو، فکرِ آخرت، تو اللہ تعالیٰ دنیا کی فکر سے اسے آزاد کر دیتے ہیں اور جس کی فکر دنیا ہی کے احوال میں سرگشتہ رہے تو اللہ کو کچھ پرواہ نہیں کہ وہ کس وادی میں ہلاک ہوتا ہے۔‘ (باب الانتفاع بالعلم والعمل به)

وہ حضرات جو اہلِ علم میں شمار کیے جاتے ہیں اور اپنی علمی عظمتوں کے باوجود اصحابِ ثروت اور ملکوں کے امرا و حکام کے پاس حاضری لگاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان سے مال و دولت کا استفادہ کریں گے اور اپنے دین کو محفوظ رکھیں گے۔ وہ حضرات غور کریں، کیا ایسا ممکن ہے؟ دیکھیے اللہ کے رسول ﷺ کیا فرماتے ہیں!

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ: ’رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’میری امت میں بعض لوگ دین کا علم حاصل کریں گے، قرآن پڑھیں گے اور کہیں گے کہ ہم حکام کے پاس جاتے ہیں، ان کی دنیا سے کچھ فایدہ اُٹھالیتے ہیں اور اپنے دین کو بچا لاتے ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں ہوتا۔ جیسے ناگ پھنی سے بجز کانٹے کے اور کیا مل سکتا ہے؟ ایسے ان امرا و حکام کے قرب سے بجز گناہ کے اور کیا حاصل ہوگا۔‘ (مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم)

حکومتیں کہیں کہ ہوں، ہندوستان کی ہو، پاکستان کی ہو، عرب ملکوں کی ہو، سب کا اثر یکساں ہے۔ اربابِ مدارس بھی درخواستوں، توصیوں اور نہ جانے کن کن راستوں سے اربابِ حکومت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے اثرات مدارس پر، اربابِ مدارس پر، طلبہ و اساتذہ پر برے مرتب ہوتے ہیں۔

❑❑❑

انسان کو اپنے عیوب کا علم کیسے ہو؟

اللہ تعالی جب کسی شخص کا بھلا چاہتے ہیں تو اسے اس کا عیبِ نفس دکھا دیتے ہیں اور جس شخص کو کامل بصیرت حاصل ہوتی ہے، اس کی نگاہ سے اس کے عیوب مخفی نہیں رہتے۔ اور جب آدمی اپنی خرابیوں اور بیماریوں کو جان لیتا ہے تو اس کا علاج اس کے لیے ممکن ہوتا ہے۔ مگر بد قسمتی سے بیشتر افرادانسانی اپنے معایبِ نفس سے بے خبر ہیں۔ انھیں دوسروں کی آنکھوں کا تنکا تو نظر آجاتا ہے مگر اپنی آنکھوں کا شہتیر دکھائی نہیں دیتا۔

اگر واقعی کسی کا ارادہ یہ ہو کہ وہ اپنے نفس کے عیوب کو جان لے تو اس کے چار طریقے ہیں:

۱۔ کسی شیخِ کامل کی خدمت میں حاضری دے جو نفس کے آفات سے واقف ہو، پوشیدہ معایب کی پہچان رکھتا ہو۔ پھر وہ اپنے آپ کو کلیتاً اس کے حوالے کر دے۔ اس کے احکام بلکہ اس اشاروں کی پابندی کرے اور جن جن مجاہدات کی وہ تلقین کرے، انھیں بجالائے۔ ایک مرید کا اپنے شیخ کے ساتھ اور ایک شاگرد کا اپنے استاذ کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے۔ وہ شیخ و مرشد اسے نفس کی خرابیوں سے آگاہ بھی کرے گا اور علاج کا طریقہ بھی بتائے گا۔

مگر ایسے شیخ کا حاصل ہونا بالخصوص ہمارے زمانے میں خاصا دشوار ہے۔

۲۔ کوئی سچا دین دار، صاحبِ بصیرت دوست مل جائے اور اسے اپنے اوپر نگراں بنا لے، جو اس کے افعال واحوال کو ملاحظہ کرتا رہے اور اس کے ناپسندیدہ اور ناشائستہ اخلاق وافعال پر ٹوکتا رہے۔ یہ طریقۂ عمل بہت سے اکابر اور بہت سے عقلا نے اختیار کیا تھا۔

امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ’اللہ کی رحمت ہو اس شخص

پر جو میرے عیوب کا ہدیہ مجھے بھیجے۔' یعنی ان سے مجھے مطلع کرے۔ چنانچہ وہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے اپنے عیوب کے متعلق دریافت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ان کی خدمت میں آئے تو انھوں نے پوچھا کہ 'میرے اندر تمھیں کوئی ایسی بات معلوم ہے جو تمھیں ناپسند ہو؟' انھوں نے معذرت کی، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصرار کیا۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ 'مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک دسترخوان پر دو سالن اکٹھا کرتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پہننے کا رات کا جوڑا الگ ہے اور دن کا جوڑا الگ ہے۔' انھوں نے پوچھا کہ 'بس یہی یا کوئی اور بات؟' عرض کیا کہ 'بس یہی دونوں باتیں۔' فرمایا کہ 'ٹھیک ہے، اب ایسا نہ ہوگا۔'

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشہور صحابی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کرتے تھے کہ 'آپ کو رسول اللہ ﷺ منافقین کے سلسلے میں راز کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ میرے متعلق تو کوئی بات نفاق کی آپ کو معلوم نہیں ہے؟'

غور کیجیے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کس قدر جلیل القدر اور عالی مرتبہ صحابی ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے نفس کو تہمت سے بری نہیں سمجھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو جس قدر وافر عقل اور عالی رتبہ کا حامل ہوگا اتنا ہی اپنے نفس سے غیر مطمئن رہتا ہے۔

لیکن ہمارے دور میں ایسے دوستوں کا ملنا بھی مشکل ہی ہے۔ بہت کم احباب ایسے ملیں گے جو مداہنت سے کام نہ لیتے ہوں اور اپنے تعلق والوں کو عیبوں سے مطلع کرتے ہوں یا حسد میں مبتلا نہ ہوں اور قدرِ واجب سے زیادہ عیبوں کو بڑھا چڑھا کر نہ پیش کرتے ہوں۔ اب دوست دو ہی طرح کے عموماً ملتے ہیں: یا تو حاسد یا صاحبِ غرض ہوتے ہیں جو ہنر کو بھی عیب سمجھ لیتے ہیں۔ مداہنت کرتے ہیں جو عیبوں کو بھی چھپا لیتے ہیں۔

اسی لیے حضرت داؤد طائی علیہ الرحمہ لوگوں سے الگ تھلگ رہا کرتے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ 'آپ لوگوں سے ملتے جلتے کیوں نہیں؟' فرمایا کہ 'میں ایسے لوگوں سے تعلق رکھ کر کیا کروں گا جو مجھ سے میرے عیبوں کو چھپائے رکھتے ہیں۔'

اس سے معلوم ہوا کہ جو واقعی دین دار اور اہلِ تقوی ہیں، وہ دل سے چاہتے ہیں کہ ان کے عیبوں کی خبر دوسروں کے واسطے سے ملتی رہے۔ لیکن ہمارا حال یہ ہو گیا ہے کہ اگر ہم کو کوئی

نصیحت کرے اور ہمارے عیبوں پر متنبہ کرے تو اس سے زیادہ ناپسندیدہ کوئی شخص نہیں۔

اور سچ پوچھیے تو اس سے آدمی کے ضعفِ ایمان کا پتا چلتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برے اعمال و اخلاق ڈس کھانے والے سانپ اور بچھو ہیں۔ اگر کوئی شخص ہمیں خبر دے کہ ہمارے کپڑے میں بچھو گھس گیا ہے تو ہم اس کے ممنون کرم ہوتے ہیں، خوشی محسوس کرتے ہیں اور فوراً اس بچھو کو مارنے بھگانے کے درپے ہوجاتے ہیں، حالاں کہ اس کی ایذارسانی کا تعلق صرف جسم سے ہے۔ جسم کی تکلیف ایک دن رہے گی یا اس سے بھی کم، اس کے برخلاف اخلاقِ رذیلہ کی تکلیف براہِ راست قلب کی گہرائیوں میں ہوگی۔ اور ممکن ہے کہ وہ موت کے بعد ہمیشہ باقی رہے یا ہزاروں سال تک قایم رہے۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ جو آدمی ہمارے اخلاقِ رذیلہ سے ہم کو خبردار کرتا ہے، ہم نہ اس سے خوش ہوتے ہیں اور نہ اس کے ازالہ کی فکر کرتے ہیں، بلکہ الٹا ہم اس سے یہ کہنے لگتے ہیں کہ 'چلو چلو! تم بھی تو ایسا ایسا کرتے ہو۔' اور اتنا ہی نہیں، اس سے آگے بڑھ کر ہم اس سے دشمنی ٹھان لیتے ہیں اور اس کی نصیحت کے فواید سے خود کو محروم کرلیتے ہیں۔ ہمارا یہ حال غالباً اس وجہ سے ہے کہ ہمارے دلوں میں قساوت پیدا ہوگئی ہے جو نتیجہ ہوتی ہے کثرت معاصی کا۔ اور ان سب کی بنیاد ایمان کا ضعف ہے۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہدایت کے طریقے ہمیں الہام فرمائے، ہمارے عیبوں پر ہمیں بصیرت عطا فرمائے اور ہمیں اس کے علاج کی توفیق بخشے۔ اور جو ہمیں ہمارے عیبوں سے مطلع کرے، اس کا احسان مند ہونے اور شکریہ ادا کرنے کی توفیق سے نوازے بمنه و فضله.

۳۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے نفس کے عیوب کو اپنے دشمنوں اور حاسدوں کی زبان سے معلوم کرے۔ کیوں کہ ناراضگی کی نگاہ ہر عیب کو ظاہر کر دیتی ہے۔ اور ایسا ہونا عین ممکن ہے کہ اپنے دشمن سے جو اس کے عیبوں کا تذکرہ کرتا پھرتا ہے، آدمی زیادہ فایدہ اٹھالے، بہ نسبت کسی ایسے دوست کے جو مداہنت کرتا ہو، اس کی مدح و ثنا کرتا ہو اور اس کے عیبوں کو چھپاتا ہو۔

لیکن دشمن کی عیب جوئی سے فایدہ اٹھانا ایک مشکل امر ہے۔ کیوں کہ فطرتِ انسانی کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ دشمن کی بات کو رد کرنا اور اس کو حسد پر محمول کرنا اس کا شیوہ ہے۔ مگر صاحبِ بصیرت آدمی دشمنوں کی عیب جوئی سے بھی فایدہ اٹھالیتا ہے۔ کیوں کہ برائیوں کا چرچا

دشمنوں کی زبان پر ہوتا ہی ہے۔ اس سے انھیں اپنے عیبوں کا پتا چل جاتا ہے۔

۴۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان رہے، ان سے ملتا جلتا رہے اور جس بات کو لوگوں کے درمیان مذموم اور بری محسوس کرے، اس کو اپنے اندر بغور ملاحظہ کرے۔ کیوں کہ ایک مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہوتا ہے۔ یعنی وہ دوسروں کے عیبوں کے آئینے میں اپنے عیوب کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ خواہشات کی پیروی میں انسانی طبیعت میں اشتراک اور یکسانیت ہے۔ تو جس بلا میں ایک شخص مبتلا ہے، دوسرا بھی اس میں کم یا زیادہ ضرور مبتلا ہوگا۔ اسے چاہیے کہ اپنے نفس کی ٹوہ میں لگا رہے اور جس چیز کو دوسروں میں وہ عیب سمجھتا ہے، اس سے خود کو پاک کرنے کی کوشش کرے۔ یہ طریقہ تادیب بہت مفید ہے۔ اگر ہر شخص اس کا التزام کرلے کہ دوسروں کے ناپسندیدہ اوصاف وخصایل کو اپنے سے جدا رکھے گا تو پھر کسی شیخ ومرشد کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ ’آپ نے ادب کس سے سیکھا؟‘ فرمایا کہ ’کسی سے نہیں۔ میں نے جاہل کی جہالت کو عیب کی چیز دیکھا تو میں نے اس سے اجتناب کیا۔‘

چوتھا طریقہ اس شخص کے لیے ہے جس کو کوئی دیدہ ور اور ناصح ومشفق شیخ جو اپنی تہذیب سے فارغ ہو چکا ہو، اور دوسروں کے نفوس کی تعلیم وتربیت میں مشغول ہو، نہ ملا ہو۔ اور اگر کسی کو ایسا شخص مل جائے تو گویا اسے طبیب مل گیا۔ اس کے ساتھ لگا لپٹا رہے۔ وہ اسے امراض باطنی اور ہلاکتوں سے بچالے گا۔ (احیاء العلوم ج۳ ص۶۴)

❑❑❑

اجتماعی معاشرے کے لیے تین ضروری باتیں

تواضع، تحمل، تامل

تین باتوں کو اپنا شعار بناؤ: تواضع، تحمل، تامل۔

تواضع کا مطلب یہ کہ تم اپنے کو سب سے کمتر سمجھو، کسی سے اپنے کو برتر نہ سمجھو اور اس سمجھنے کے مقتضا پر عمل کرو۔ یعنی جس طرح کی خدمت چھوٹے لوگ انجام دیا کرتے ہیں، تم اس میں کوئی عار محسوس نہ کرو۔

تحمل کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے مزاج کے خلاف کوئی کام یا بات ہو تو طیش میں مت آؤ، اسے سہہ جاؤ اور اس پر غور کرو۔ جتنی چیز تمھارے حال کے مناسب ہو، اسے اخذ کر لو اور باقی کو ذہن سے نکال دو۔

تامل کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام میں عجلت نہ کرو بلکہ خوب سوچ سمجھ لو، پھر اس پر اقدام کرو۔ اسی میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی نے کسی کے متعلق کوئی ایسی چیز تمھارے پاس پہنچائی جو تمھارے لیے تکلیف دہ ہے تو فوراً اس آدمی کی طرف سے تکلیف میں نہ آجاؤ اور نہ اس سے بدگمان ہو۔ خوب غور کر لو اور جتنی تاویل کی گنجایش ہو، کر لو، تب فیصلہ کرو۔ اجتماعی معاشرہ میں رہنے کے لیے یہ تینوں چیزیں ضروری ہیں۔ (اقتباس از مکتوب بنام حافظ منہاج الدین صاحب)

آج کل ایک لفظ بہت رائج ہے۔ وہ یہ کہ احساسِ کمتری میں مت مبتلا ہو۔ اور تواضع کا مطلب یہ بتایا گیا کہ اپنے کو سب سے کمتر سمجھو۔ بظاہر ان دونوں باتوں میں تضاد ہے۔ اس کا حل کیا ہوگا؟

جواب: اگر احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے کو اونچا اور برتر سمجھنا چاہیے

تو یہ بات بالکل غلط ہے۔ اپنے کو اونچا اور برتر سمجھنا تکبر ہے، جو شریعتِ الٰہی کے نزدیک بھی اور فطرتِ انسانی کے نزدیک بھی سخت جرم ہے۔ اس کی اجازت کون دے سکتا ہے؟ اس معنی کے لحاظ سے احساسِ کمتری سے بچنے کی تاکید کا مطلب یہ ہوگا کہ تکبر اختیار کرو، جو یقیناً گناہِ کبیرہ ہے۔

اور اگر احساسِ کمتری کا مطلب پست ہمتی ہے تو اس سے بچنا یقیناً ضروری ہے۔ پست ہمت آدمی ہر کام سے ڈرتا ہے، اس کے انجام دینے سے گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ کام کیسے ہوگا؟ اگر احساسِ کمتری سے بچنے کا معنی یہ ہے کہ پست ہمتی سے بچو، تب بالکل صحیح ہے۔ لیکن اس کا تواضع سے کوئی ٹکراؤ اور تصادم نہیں ہے، بلکہ تواضع وہی کرسکتا ہے جو پست ہمت نہ ہو۔ پست ہمتی کے مقابلہ میں بلندیِ حوصلہ ہے۔ جس کا حوصلہ بلند ہوگا وہی اپنے اندر اس کی ہمت پائے گا کہ دوسروں کے سامنے اپنے کو چھوٹا بنا کر پیش کرے۔ پست حوصلہ آدمی تواضع نہیں کرسکتا، اسے اس میں اپنی ذلت معلوم ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کو جیسے تواضع پسند ہے اسی طرح ہمت کی بلندی بھی پسند ہے۔ فرمایا کہ ”اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ مَعَالِي الْهِمَمِ“. (سیوطی) اللہ تعالیٰ بلند ہمتوں کو پسند فرماتے ہیں۔ حوصلہ پست ہوگا تو آدمی کاہل اور نکما ہو کر رہ جائے گا۔ اور ہمت بلند ہوگی تو آدمی مشکل سے مشکل امور انجام دے ڈالے گا۔ اور اس سے وہ خدا کے یہاں بھی مقبول ہوگا اور بندگانِ خدا بھی اسے استحسان کی نظروں سے دیکھیں گے۔

اپنے کو چھوٹا اور کمتر سمجھے گا تو اس کی کسی سے لڑائی نہیں ہوگی۔ اور بلند حوصلہ ہوگا تو کسی مشکل کام سے گھبرائے گا نہیں۔

* * *

خطبہ صدارت

اختتامی اجلاس شعبۂ مناظرہ دارالعلوم دیوبند

حضرات طلبہ عزیز! آپ نے اپنے اس سال کے اس اختتامی جلسہ میں ایک ایسے شخص کو شرکت کا اعزاز بخشا ہے جس کو اس مجلس کے موضوع یعنی فنِ مناظرہ سے مناسبت نہیں ہے۔ اور یہی ایک فن کیا؟ اس شخص کو تو کسی فن سے مناسبت نہیں۔ اس کے ظاہر پر علم کے آثار چسپاں ہو گئے ہیں، لوگ غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اس کو علم سے یا علم کے کسی شعبہ سے تعلق ہوگا، لیکن یہ واقعہ نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شخص نے کچھ حروف پڑھے ضرور ہیں، اساتذہ کے سامنے کتاب لے کر بیٹھا ہے اور اساتذہ سے سنی ہوئی باتیں جو یاد رہ گئی ہیں، دہراتا ہے۔ مگر جوں جوں عمر کا کارواں آگے بڑھ رہا ہے، جہل کا احساس گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ احساسِ جہل کے بعد آپ حضرات کے سامنے کچھ عرض کرنا سامانِ رسوائی ہی ہے، لیکن آدمی مانتا بھی نہیں، اپنی رسوائی کا سامان عام کر کے ہی رہتا ہے۔ یہ شخص جس کی رسوائی کا کچھ سامان آپ نے کیا ہے، اب خود بھی اپنی رسوائی کا سامان پھیلا رہا ہے۔

حضرات طلبہ! میں نے عرض کیا کہ آپ نے جس موضوع پر سال بھر محنت کی ہے، اس سے مجھے مناسبت نہیں ہے۔ اس لیے اصحابِ فن نے اس فن کی کیا تعریف کی ہے؟ اس کا موضوع کیا بتایا ہے؟ اس کی غرض وغایت کیا بیان کی ہے؟ مجھے معلوم نہیں، اور نہ معلوم کرنے کا ایسا شوق پیدا ہوا کہ کتابوں میں تلاش کرتا۔ میں تینوں باتوں کا حاصل ایک بات کو سمجھتا ہوں۔ وہ ہے تحقیقِ حق۔

دنیا میں باتیں بہت پھیلی ہوئی ہیں، بلکہ غور کیجیے تو دنیا میں باتوں ہی کی حکمرانی ہے۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ بات کرتا ہے۔ دل ودماغ سے سوچتا اور زبان سے بولتا ہے۔ اور ہر بولنے والے کو

اصرار ہوتا ہے کہ اس کی بات سب لوگ تسلیم کر لیں۔ باتوں کے اس ہجوم میں ہر بات صحیح نہیں۔ بارش ہوتی ہے تو زمین میں ہر طرح کے پودے گھاس اور درخت وغیرہ اُگ آتے ہیں لیکن ہوشیار کسان ان میں سے وہ چیزیں چھانٹ دیتا ہے جو اس کی کھیتی کے لیے غلط ہوتی ہے۔ اسی طرح دماغوں کی زرخیزی اللہ جانے کیا کیا چیزیں پیدا کر لیتی ہے، اور زبان کے راستے سے وہ تمام چیزیں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ اگر ہر بات مان لی جائے تو زندگی کا نہیں بلکہ کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ پس لازم ہے کہ مفید اور مضر باتوں میں امتیاز پیدا کیا جائے، صحیح اور غلط کو پرکھا جائے۔ خود صحیح اور غلط کا معیار قایم کیا جائے اور اسی معیار پر باتوں کو پرکھا جائے۔ یہ بڑی محنت اور جانکاہی کا کام ہے اور بہت نازک اور دقیق بھی ہے۔

لیکن تحقیقِ حق کے اس سفر میں پہلے ہی یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اگر یہ کام صرف انسانی دماغوں کے سپرد کر دیا جائے تو کبھی کوئی حق واضح نہ ہوگا اور نہ باطل کی شناخت ہوگی۔ یہ مان لینا ضروری ہے کہ انسانی دماغ سے بالاتر اس کا کوئی معیار ہونا چاہیے جس کو تسلیم کر کے دماغوں کی پیداوار اور زبانوں کی کاشت کو اس کے سامنے رکھا جائے۔ جو اس معیار کے مطابق ہو اسے مان لیا جائے کہ حق ہے، اور اس کے مخالف ہو تو یقین کر لیا جائے کہ وہ باطل ہے۔

اور مذاہب والے تو جو چاہیں کہیں، لیکن اہلِ اسلام کے پاس دماغ سے بالاتر کسوٹی موجود ہے۔ اور وہ ہے وحیِ الٰہی، جو اللہ تعالی اپنے معصوم بندے پر نازل فرماتے ہیں۔ اس میں کسی طرح کی غلطی کا امکان نہیں ہوتا: ’لَا يَـأْتِيـهِ الْبَـاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيْلٌ مِنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ‘. (حم سجدہ: ۴۲) اس میں باطل کسی طرف سے دراندازی نہیں کر سکتا، نہ سامنے سے، نہ پیچھے سے۔ نزول کا یہ عمل اسی ذات کی بارگاہ سے ہے جو صاحبِ حکمت بھی ہے اور لایق حمد بھی ہے۔ اس کی کوئی بات نہ حکمت کے خلاف ہے اور نہ حکمت سے خالی ہے۔ وہاں جو کچھ ہے حمد وثنا اس کے لیے ثابت ہے۔ یہ وحیِ الٰہی جو حق وصداقت کا معیار ہے ہمارے ہاتھوں میں قرآن کریم کی صورت میں بھی ہے، سنت رسول ﷺ کی صورت میں بھی۔

ہمارے پاس حق وصداقت کے یہ دو معیار ہیں۔ انھیں دونوں معیار پر ہر بات اور ہر کسی کی بات پرکھی جائے گی۔ لیکن اس پر پرکھنے کے لیے انسانی عقل درکار ہے۔ اسی لیے اللہ تعالی نے

قرآن کریم میں بار بار تدبر وتفکر اور استعمالِ عقل کا حکم دیا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ وہ عقل ہونی چاہیے جو وحیِ الٰہی کی صداقت وحقانیت کو بلا ریب وتردد تسلیم کر چکی ہو۔ یہ مان کر وہ اس معیار پر غور کرے تو اس پر حقانیت کی راہیں کھلتی چلی جائیں گی۔ اور اگر عقلِ انسانی کو وحیِ الٰہی کی پابندی کے بغیر آزادانہ غور وتدبر کی اجازت دیدی جائے تو متضاذات نظریات کا اس قدر تصادم ہوگا کہ کوئی عقل اس تصادم کو روک نہیں سکتی۔

حضرات طلبہ! آپ ابھی تو مادرِ علمی کی آغوش میں ہیں، یہاں آپ باطل کی یلغار سے بڑی حد تک محفوظ ہیں۔ لیکن جب اس آغوشِ رحمت سے باہر نکل کر انسانوں کے ہجوم میں آئیں گے تو طرح طرح کے نظریات، عقاید وفلسفہ اور افکار وخیالات کی متضاذ بھیڑ میں اپنے کو گھرا ہوا پائیں گے۔ اس وقت دو باتوں کی بڑی ضرورت ہوگی۔ ایک تو اپنے عقیدہ وعمل اور فکر و نظر میں ایسے رسوخ اور ایسی صلابت کی کہ کوئی دوسرا نظریہ خواہ کتنا ہی خوش نما ہو اور کوئی بھی دنیاوی ترغیب خواہ کتنی ہی دل لبھانے والی ہو، آپ کو آپ کے عقیدہ وعمل سے ایک انچ بھی کھسکا نہ سکے۔ آپ کی مثال اس چٹان جیسی ہو جس سے سیلاب آکر ٹکراتا ہو اور واپس چلا جاتا ہو، مگر چٹان کو کوئی جنبش نہ ہوتی ہو۔

دوسرے یہ کہ آپ علمی اور ذہنی ودماغی اعتبار سے اتنے مستعد ہوں کہ باطل نظریات و خیالات کی ترجمانی خواہ کوئی کتنی ہی خوبی کے ساتھ کرتا ہو، اس کے نقص وعیب کو پکڑ کر آپ اس کے سامنے بھی اور عامۃ الناس کے سامنے بھی اچھی طرح نمایاں کر سکیں۔ اس کے لیے علم کی وسعت اور گہرائی کے ساتھ ذہن ودماغ کی بڑی صلاحیت درکار ہوگی۔

میں اس کی مثال میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک مناظرہ پیش کرتا ہوں جس میں خوارج نے اپنے خیالِ باطل کے حق میں بظاہر بڑی مضبوط اور خوب صورت دلیلیں پیش کی تھیں۔ یہ مناظرہ مشہور محدث ابوعمر یوسف بن عبدالبر (م:۴۶۳ھ) نے اپنی مشہور کتاب ”جامع بیان العلم و فضلہ“ میں نقل کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے خوارج سے...... جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر قرار دینے پر تلے ہوئے تھے...... کہا کہ ’تم کو ان پر کیا کیا اعتراض ہیں؟‘ بولے کہ ’تین

اعتراض ہیں:

۱۔ یہ کہ انھوں نے اللہ کے امر میں رجال کو حَکم (فیصل) مان لیا، حالاں کہ اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ "ان الحکم الا للہ" فیصلہ تو صرف خدا کا ہے۔ (جنگِ صفین کے موقع پر واقعہِ تحکیم کی طرف اشارہ ہے جس میں حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما نے دو بزرگوں کو حَکم مانا تھا۔ اس پر خوارج کو شدید اعتراض تھا)

۲۔ یہ کہ انھوں نے جنگ تو ضرور کی مگر فریقِ مخالف کے آدمیوں کو نہ قیدی بنایا اور نہ مالِ غنیمت حاصل کیا۔ اگر وہ لوگ اہلِ ایمان تھے تو ان سے جنگ جائز نہ تھی اور اگر کافر تھے تو انھیں قید اور ان کے مال کو مالِ غنیمت بنانا جائز تھا۔

۳۔ یہ کہ انھوں نے صلح نامہ کی تحریر میں اپنے نام کے ساتھ 'امیر المومنین' کے لفظ کو مٹانے کو قبول کیا۔ تو اگر وہ امیر المومنین نہ تھے تو امیر الکافرین تھے؟'

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ 'اگر میں تمھاری ان تینوں باتوں کا جواب قرآن سے اور سنتِ رسول ﷺ سے دوں تو تم مان جاؤ گے؟ اور اپنے خیالات سے رجوع کرلو گے؟' انھوں اقرار کیا 'بے شک'!

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ 'اچھا تو سنو! اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ: یَـاَیُّهَـا الَّـذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوْا الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِثْلُ مَا قَتَلَ مِـنَ النَّعَمِ یَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ (مائدہ:۹۵) اے ایمان والو! شکار کا جانور حالتِ احرام میں مت مارو۔ اور جو کوئی تم میں سے جان بوجھ کر شکار کا جانور مار ڈالے تو اس پر بدلہ ہے چوپایوں میں سے اس جانور کے مثل جس کو مارا ہے۔ اس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر آدمی کریں گے۔

اسی طرح اللہ تعالی نے زوجین کے اختلاف کے بارے میں فرمایا کہ: وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِنْ اَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ اَهْلِهَا (نساء:۳۵) اگر تم لوگوں کو زوجین کے درمیان نا اتفاقی کا اندیشہ ہو تو ایک حَکم شوہر کے گھر والوں میں سے اور ایک حَکم عورت کے گھر والوں میں مقرر کرلو۔

اب تمھیں بتاؤ کہ اللہ تعالی نے آدمیوں کو حَکم بنایا یا نہیں؟'

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ’جنگ حضرت عایشہ صدیقہ ام المومنین رضی اللہ عنہا سے ہوئی تھی، تو کیا تم اپنی ماں حضرت عایشہ کو قیدی بناؤ گے؟ اور انھیں حلال قرار دو گے؟ اگر تم ہاں کہتے ہو تو کفر میں گرتے ہو، اور اگر کہتے ہو کہ وہ ہماری ماں ہی نہیں تو بھی کفر میں پڑتے ہو۔ بتاؤ ایسا ہے کہ نہیں؟‘

اب تیسرے سوال کا جواب سنو کہ ’حضرت علی نے اپنے نام کے ساتھ امیر المومنین کا لفظ حذف کیا تھا۔ صلحِ حدیبیہ کے موقع پر جب صلح نامہ پر ’محمد رسول اللہ‘ لکھا گیا تو کفار کے قاصد سہیل بن عمرو نے اعتراض کیا تو حضرت نے فرمایا کہ ’اے اللہ! آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کا رسول ہوں۔ اے علی! ’رسول اللہ‘ کے لفظ کو مٹا دو۔ چنانچہ وہ مٹا دیا گیا۔‘

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے اس مناظرہ سے دو ہزار خوارج نے توبہ کر لی تھی۔ اس مناظرہ میں وہ سب چیزیں موجود ہیں جن کی ضرورت ہے۔ علم کا رسوخ، قرآن کریم کے مضامین کی وسعتِ معلومات، ذہانت و برجستگی اور عقل و تحمل کا کمال۔ پھر اپنی بات سمجھانے کا بہترین انداز!

حافظ ابوعمرو بن عبدالبر نے مناظرہ کی متعدد مثالیں اس کتاب کے ’باب اثبات المناظرہ و المجادلة و اقامة الحجة‘ میں پیش کی ہیں۔ اس باب کا مطالعہ موجبِ بصیرت ہوگا۔

مدرسہ کی چہار دیواری سے نکل کر جب آپ زندگی کے عام میدان میں اتریں گے تو ہر طرح کے اور ہر خیال کے لوگ ملیں گے۔ انفراداً بھی اور اجتماعاً بھی۔ آپ کو اتنا مستعد رہنا ہے کہ جس خیال کا بھی فرد یا مجمع ہو، اسے آپ عقایدِ حقہ، اعمالِ صحیحہ اور افکارِ سلیمہ پر مطمئن کر سکیں۔

ایک بات کا اور آپ کو دھیان بطور خاص رکھنا ہے۔ وہ یہ کہ آپ کے مقابلہ میں دو طرح کے لوگ آئیں گے۔ بعض تو وہ ہوں گے جو حق کے مقابلہ میں باطل کو لائیں گے، اسلام کے مقابلہ میں کفر کو پیش کریں گے۔ ہدایت سے ضلالت کو ٹکرائیں گے۔ یہ لوگ اسلامی تعلیمات پر اعتراض بھی کریں گے اور اپنے باطل مذہب کی تائید بھی کریں گے۔ ان کے مقابلے میں تو آپ کو کوئی نرمی اور مداہنت نہیں کرنی ہے۔ کفر و شرک تو قطعی باطل اور بلا ریب غلط نظریہ ہے۔ اس سے مصالحت کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ

عَلَيْهِمْ (تحریم:۹) اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے۔ موجودہ دور میں منافقین کی مثال قادیانی ہیں جو اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں لیکن اندر سے پورے کافر ہیں۔ روافض بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔

دوسرے وہ جن سے ایمان وکفر کا اختلاف نہیں ہے۔ وہ آپ کے حق کے مقابلہ میں باطل اور اسلام کے مقابلہ میں کفر وشرک نہیں لاتے، لیکن ان سے تاویل وتوجیہ کا اختلاف ہوتا ہے۔ عمل کے دو پہلو میں کسی ایک پہلو کی ترجیح کا اختلاف ہوتا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو کسی مسئلہ میں ’ما انا عليه و اصحابى‘ کی شاہراہ چھوڑ کر متفرق راہوں پر چل پڑتے ہیں۔ ان کی چال دہری ہوتی ہے۔ اکثر مسائل ومعاملات میں وہی راہ چلتے ہیں جو اہلِ سنت کی شاہراہ ہے، لیکن کہیں کہیں موڑ لے کر دوسری طرف نکل پڑتے ہیں۔ اور ان کا موڑ لینا کسی تاویل یا کسی عالم کے ذوق کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ پھر یہ لوگ انھیں مسائل ومعاملات کو اپنی شناخت اور دین وایمان کا معیار بنالیتے ہیں، حالاں کہ وہ تاویلات یا وہ ذوق ووجدان اتنے اہم نہیں ہوتے کہ ان کو معیارِ ایمان وکفر قرار دیا جائے یا انھیں معیارِ حق وباطل سمجھا جائے۔

اس زمرے میں مسلمانوں کے وہ فرقے آتے ہیں جو اصولی عقاید میں راہ حق پر ہی ہیں، قرآن وسنت کو دل سے تسلیم کرتے ہیں، وحدانیت ورسالت پر ایمان رکھتے ہیں، آخرت جنت وجہنم کو انھیں تفصیلات کے ساتھ مانتے ہیں جو حضرات انبیاے کرام علیہم السلام نے بتائے ہیں۔ تقدیر پر ان کا ایمان ہے، ملائکہ کو، اللہ کی کتابوں کو، تمام انبیا کو من وعن تسلیم کرتے ہیں۔ راستہ وہی ہے جو حق ہے، لیکن قرآن وسنت کی توجیہ میں کہیں کہیں ایسا راستہ اختیار کرلیتے ہیں جو دینِ محمدی کے مزاج اور روح کے خلاف ہوتا ہے۔ میں ان میں سے چند فرقوں کا نام بھی لیتا ہوں جو اس وقت موجود ہیں اور اپنی شناخت باقی رکھنے کی سرگرمیوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں تعداد اور کج روی کے اعتبار سے ہندوستان وپاکستان کا بڑا فرقہ بریلویوں کا ہے۔ یہ فرقہ بڑا جارح اور تنگ نظر ہے۔ یہ ابتدا ہی سے ایمان وکفر کی زبان میں بات کرتا ہے۔ تاویلاتِ فاسدہ میں اس فرقہ کے لوگ بہت دور تک پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کی تاویلات کی زد میں اعمال سے زیادہ عقاید ہیں۔ اور یہ لوگ اتنی مہمل اور بے معنی تاویلات عقاید میں کرتے ہیں کہ بظاہر بعض اوقات دائرۂ اسلام سے

باہر دکھائی دیتے ہیں۔ ملک کے ہر گوشے اور ہر خطے میں اس فرقہ کے لوگ موجود ہیں۔ اور ہمارے فضلا وعلما کو سب سے زیادہ سابقہ انھیں سے پڑتا ہے۔ یہ براہ راست علماے دیوبند ہی کو نہیں بلکہ علماے حق کو کافر قرار دے کر عوام کو حق کی راہ سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔

دوسرا فرقہ غیر مقلدین کا ہے۔ یہ سنت کی تاویل میں جمود اختیار کر کے ایک مستقل فرقہ بن گیا ہے۔ اس فرقہ کو بعض جزئی وفروعی مسائل میں احناف سے اختلاف ہوا، اس میں انھوں نے اتنی شدت اختیار کی کہ احناف کو گمراہ اور خلافِ سنت بلکہ جو غلو میں زیادہ آگے نکل چکے ہیں وہ کافر بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہ لوگ ان بعض مسائل میں جن کے اندر احناف سے اختلاف کیا ہے، دوسرے ایمہ کے موافق ہیں، لیکن انھوں نے اپنے طریقہ عمل سے اور دستورِ اختلاف میں ایمہ والا راستہ نہیں اختیار کیا کہ دوسروں کے لیے بھی صحت وصواب کی گنجایش باقی رکھتے۔ انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ صحت وصواب اور اتباعِ سنت کو اپنے دائرے میں منحصر کر کے دوسرے ایمہ کے ماننے والوں پر بھی حملہ آور ہو گئے۔ اور اس کے لیے انھوں نے تقلید کا بہانہ بنایا اور اس کی من مانی تشریح کر کے گمراہی کے خانے میں اسے ڈال دیا۔ اور باوجودے کہ زیادہ تر مسائل میں دیگر ایمہ کی موافقت کرتے ہیں، تقلید کی بنا پر ان کے سب متبعین کو گمراہ قرار دیتے ہیں۔ پھر اپنی علاحدہ شناخت کے لیے بعض مسائل میں سب سے جداگانہ راہ اختیار کر لی۔ مثلاً طلاقِ ثلاثہ بیک مجلس کا مسئلہ اور رکعاتِ تراویح کے آٹھ ہونے کا مسئلہ۔ ان دونوں مسائل میں یہ تمام ایمہ کو چھوڑ کر اپنی علاحدہ شناخت بنانے پر مصر ہیں۔

تیسرا فرقہ جماعتِ اسلامی کا ہے۔ اس فرقہ کا آغاز اقتدار وحکومت کی ہوس کی بنیاد پر ہوا ہے۔ یہ اصلاً ایک سیاسی پارٹی ہے لیکن مسلمانوں میں مقبولیت اور تقدس سیاست کی راہ سے ملنے کا امکان نہ تھا، اس لیے اس کے بانی نے دین ومذہب کا لبادہ اوڑھا اور پھر دین ومذہب کی وہ جاذبِ نظر توجیہ وتاویل کی کہ جاہ پرست دماغوں نے اسے اپنی صدا سمجھ کر قبول کیا۔ اس فرقہ کا لٹریچر، اس کے افراد، اس کے تعلیمی وانتظامی ادارے، سب پر سیاست کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ اپنے سیاسی افکار ونظریات کے باعث یہ فرقہ دین کے باب میں خاصا بے باک ہے۔ اسے تمام دینی اعمال کی سیاسی توجیہ کرنے میں بڑی دلچسپی ہے۔ اور جس چیز کی سیاسی توجیہ یہ لوگ نہیں

کر پاتے، اسے یا تو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں یا اس کی اہمیت گھٹا دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ذکر و تلاوت، نوافل اور نماز کے اہتمام وغیرہ میں یہ لوگ بہت سست اور ڈھیلے ہیں۔ ہاں پروپیگنڈہ، اپنے قلم و زبان سے اپنے کارناموں کی تشہیر وغیرہ میں بہت چست اور مستعد ہیں۔

ان کے علاوہ بھی کچھ فرقے ہیں جو تاویلات و توجیہات کی راہوں پر چل کر سنت کی راہ سے ہٹتے اور کٹتے رہتے ہیں۔ سب کی تشریح و تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ زیادہ تر جن فرقوں سے آپ کا سابقہ پڑے گا، ان کا ذکر کر دیا گیا۔

ان فرقوں سے گفتگو کرنے میں وہ رویہ نہیں اختیار کیا جانا چاہیے جو مطلق باطل کے مقابلہ میں کیا جاتا ہے۔ ان سے مناظرہ کرنے میں حکمت اور موعظتِ حسنہ کی بڑی ضرورت ہے۔ ان کے مقابلہ میں جو صدق و صواب ہے، اسے واضح کر دینا ضروری ہے۔ اور تاویلات و توجیہات میں جہاں جہاں غلطی ہو یا تاویل تحریف کے اندر داخل ہوگئی ہو، اسے دلایل سے بیان کر دینا چاہیے۔ لیکن یہ چیز بقدر ضرورت ہو۔ پوری زندگی پر یہ موضوع چھا جائے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ تاہم بسا اوقات ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کام کے لیے مستعد ہوں۔ احقاقِ حق اور ابطالِ ناحق کی ذمہ داری بھی بڑی ہے لیکن نازک ہے۔ بہت دیکھ بھال کر قدم رکھنا چاہیے اور ہر وقت دیکھتے بھالتے رہنا چاہیے۔

اب چند باتیں ان لوگوں کی خدمت میں گوش گزار کرنا چاہتا ہوں جن کو ضرورت کے تحت کبھی بھی تقریری یا تحریری مناظرہ کی کی نوبت آسکتی ہے:

۱۔ مناظرہ کرنے والے کو اول و آخر جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، وہ تحمل ہے۔ اسے مخاطب کی کسی بات سے خواہ وہ کیسی ہی اشتعال انگیز ہو، مشتعل اور چراغ پا نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے ذہنی توازن بگڑ جائے گا اور مخاطب کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

۲۔ اس کا مطالعہ قرآن و حدیث کا بہت گہرا ہو۔ زندگی بھر اس کا اشتغال رکھے۔ حق کی راہ انھیں دونوں سے کھلتی ہے۔ ان کا اگر مناسب علم نہ ہو تو اللہ جانے کہاں گمراہی کے کھڈ میں آدمی گر جائے گا۔

۳۔ جس موضوع پر مناظرہ ہو رہا ہے، اس موضوع پر مخالف اور موافق دونوں طرح کے علما

کے اقوال مستحضر رہنے چاہئیں۔ ان کا دقتِ نظر سے مطالعہ کرے اور ہر ایک مفہوم ذہن میں محفوظ رکھے، ورنہ باطل سے دھوکا کھا جائے گا۔

۴۔ مناظر اپنی زبان اور قلم سے کوئی کچی اور بے سند بات نہ کہے اور نہ لکھے۔ مناظر کی ایک کچی بات پورے مناظرہ پر پانی پھیر دیتی ہے۔ جو کچھ کہے برجستہ کہے لیکن وہ سوچی سمجھی بات ہو۔ جس کو اٹھانا پڑے تو اٹھا سکے یعنی اس سے معذرت نہ کرنی پڑے۔

۵۔ مناظر اپنی نیت صحیح رکھے۔ یعنی جذبہ اثباتِ حق کا ہو۔ اپنی نفسانیت، اپنا غلبہ، اپنی عزت وغیرہ نہیں، بس یہ کہ حق کا اظہار و اثبات ہو جائے۔ اور اس کے ساتھ قبولِ حق کا بھی جذبہ ہو کہ اگر حق بات مخاطب کے منھ سے نکلی تو اسے قبول کر لینا ہے۔ یہ نہیں کہ اس نے کوئی صحیح اور سچی بات کہی تو تاویل کر کے اسے بھی غلط کر دیا جائے۔

مشہور ہے کہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ سے ان کے صاحبزادے حضرت حماد نے باطل فرقوں سے مناظرہ کی اجازت چاہی تو امام صاحب نے اجازت نہیں دی۔ انھوں نے عرض کیا کہ ’آپ تو مناظرہ کیا کرتے تھے۔‘ فرمایا کہ ’ہاں مگر میرے اور تمھارے مناظرہ کرنے میں فرق ہے۔ تم مناظرہ کروگے تو تمھارے دل میں یہ خواہش چھپی ہوگی کہ مخاطب کے منھ سے کوئی غلط بات نکلے کہ میں اس کی گرفت کر کے بے عزت کر دوں۔ گویا تم اس کے کفر اور فسق کے خواہش مند ہو۔ اور میں مناظرہ کرتا تھا تو میرے دل میں یہ خواہش رہتی تھی کہ مخاطب کی زبان سے کوئی صحیح بات نکل آئے تو میں اسے قبول کرلوں۔‘ (مناقب امام ابوحنیفہ لکردی: ج ۱، ص ۱۲۱۔ مطبوعہ حیدر آباد)

واقعی بہت کام کی بات ہے۔ اس کا اہتمام مناظر رکھے تو بہت کچھ ہدایت پھیلنے کی امید ہے۔

۶۔ مناظرہ کرنے والوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ حق تعالی کی بارگاہ میں نہایت تضرع وزاری سے دعا کریں اور دوسرے اللہ والوں سے بھی دعا کرائیں کہ اللہ تعالی صراط مستقیم پر قائم رکھیں۔ زبان سے وہی بات ادا ہو جو حق تعالی کی بارگاہ میں مقبول اور پسندیدہ ہو۔ حق کی صحیح ترجمانی کی توفیق ہو۔ کسی بات میں غلو نہ پیدا ہو۔ وہ اس دعا کو مستقلاً وظیفہ بنا لے جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: اَللّٰھُمَّ اَرِنَاالْحَقَّ حَقّاًوَارْزُقْنَااِتِّبَاعَه وَاَرِنَاالْبَاطِلَ بَاطِلاً وَارْزُقْنَااِجْتِنَابَه.

۷۔ آخری اور بہت ضروری بات یہ ہے کہ مناظرہ میں اہلِ باطل سے اختلاط ہوتا ہے، ان کے تعاقب کی فکر ہوتی ہے، ان کا بار بار تذکرہ ہوتا ہے، ان کی کتابیں پڑھنی پڑتی ہیں، ان کی ہفوات سننی پڑتی ہیں۔ اس سے قلب کا ستیاناس ہوجاتا ہے۔ بسا اوقات طاعات وعبادات سے بے رغبتی ہوجاتی ہے، معصیت کی طرف میلان بڑھنے لگتا ہے۔ زبان کے گناہ میں کثرت سے ابتلا ہوجاتا ہے، فضول بک بک کی عادت ہونے لگتی ہے، اس کے ساتھ اپنی تعریف کی لا متناہی ہوس دل میں پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا کوئی تعریف نہیں کرتا تو خود ہی اپنی تعریف اور اپنی عظمت و رفعت کا راگ الاپتا رہتا ہے۔ اس کے نتیجے میں آدمی کا قلب بھی تباہ ہوجاتا ہے اور زبان بھی فاسد ہوجاتی ہے، اور اللہ جانے کیسے کیسے روگ طبیعت میں پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایسا آدمی بسا اوقات باطل کو شکست تو دیدیتا ہے لیکن اپنے نفس اور شیطان سے شکست کھاجاتا ہے۔ دین کی تائید تو ہوجاتی ہے مگر یہ ’رجل فاجر‘ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ بڑے خسارے کی بات ہے۔

اس لیے اپنے قلب اور باطن کی نگرانی ہمیشہ رکھنی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باطل کا سیاہ دھواں قلب کو غلیظ بنادے۔ اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ کسی صاحبِ نسبت بزرگ سے اپنا رابطہ رکھے۔ کچھ وقت نکال کر عقیدت ومحبت سے ان کی خدمت میں رہے۔ بزرگوں کی خدمت وصحبت سے قلب کو زندگی اور باطن کو جلا ملتی ہے۔ اگر اس کا موقع نہ ہو تو اہل اللہ کی کتابیں مسلسل مطالعہ میں رہنی چاہئیں۔ بسا اوقات ان کتابوں سے بھی وہی فایدہ حاصل ہوا ہے جو ان کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔

ہم نے بہت دیکھا ہے، پچھلی تاریخ میں بھی اور دورِ حاضر کے مشاہدات میں بھی کہ ایک آدمی باطل کے تعاقب میں چلا اور اس میں اسے اتنا انہماک ہوا کہ وہ اپنے آپ سے غافل ہوا، اور کسی اور دلدل میں پھنس گیا۔ طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں اس کی مثالیں بھی دیتا لیکن عاقل کے لیے اشارہ کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق وصداقت کی راہ پر قایم رکھیں۔

اعجاز احمد اعظمی

۱۰؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ

* * *

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ

تقریباً ڈیڑھ صدی کا عرصہ گزرا، شمال مغربی ہندوستان کے ایک مردم خیز قصبہ دیوبند میں چند مخلص اور بلند حوصلہ اللہ والوں کی نگرانی اور سرپرستی میں مسجدِ چھتہ کے صحن میں انار کے ایک درخت کے نیچے ایک استاذ کے سامنے ایک طالب علم کتاب کھولے ہوئے ایک عظیم الشان درسگاہِ علم و فضل کی بسم اللہ کر رہا تھا۔ دنیا یہ دیکھ رہی ہے کہ ایک نوعمر طالب علم ہے، جو ایک سن رسیدہ معلم کے حضور ایک کتاب پڑھ رہا ہے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ مستقبل کے ایک عظیم و رفیع ادارہ کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ ان اربابِ ہمت کی عقابی نگاہیں، اس وقت بھی دیکھ رہی تھیں کہ ایک معلم اور ایک متعلم کے واسطے سے علم کی جو درس گاہ کھولی جارہی ہے، وہ مستقبل کا ایک عظیم دارالعلوم ہی نہیں مسلمانوں کی سلطنتِ عظمٰی جو اب کھنڈر بن چکی ہے، اس کھنڈر پر ملتِ اسلامیہ کی ایک نئی تعمیر کھڑی ہو رہی ہے۔ شگونِ نیک ملاحظہ ہو کہ معلم بھی محمود ہے اور متعلم بھی محمود ہے۔ مولانا محمود صاحب دیوبند ہی کے رہنے والے ایک بڑے عالم اور بڑے بزرگ تھے، میرٹھ میں پڑھاتے تھے، دیوبند کے بزرگوں نے انھیں دارالعلوم کے لیے میرٹھ سے دیوبند بلالیا۔

اور طالب علم وہی بزرگ ہستی ہے، جس کا نام مضمون کی پیشانی پر جگمگا رہا ہے، اس وقت دارالعلوم کا جو نصاب تھا، اس کی تکمیل کر کے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ سے علم حدیث کی تحصیل فرمائی۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی ولادت ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں بریلی میں ہوئی، جہاں ان کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی سرکاری محکمۂ تعلیم سے وابستہ تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا، دیوبند کے بلند پایہ عالم مولانا مہتاب علی صاحب علیہ الرحمۃ سے حاصل کی۔ جن

دنوں قدوری اور شرح تہذیب پڑھ رہے تھے، اسی دوران دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں عمل میں آیا اور حضرت شیخ الہند اس کے پہلے باقاعدہ طالب علم بنے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے حضرت شیخ الہند کی تعلیم وتربیت کا خاص اہتمام فرمایا۔ ایک مدت دراز تک وہ حضرت نانوتوی کی صحبت میں رہے، اور ان سے استفادہ کرتے رہے۔ ان کی خدمت میں رہ کر تمام علوم نقلیہ اور عقلیہ میں مہارت حاصل کی۔ ۱۲۹۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں مسندِ تدریس پر فائز ہوئے۔

مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی 'نزھة الخواطر' میں لکھتے ہیں کہ:

> ’’میں ان سے دیوبند میں متعدد بار ملا ہوں۔ میں نے انھیں عبادت اور ورع وتقویٰ کا بہت پابند پایا۔ قیامِ لیل (تہجد) کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ روایت میں محتاط، فہم وادراک میں بہت تیز، مذاکرۂ علمی کے نہایت شایق، فقہ واصول فقہ پر خصوصی توجہ رکھتے تھے۔ متون احادیث کے حافظ تھے۔ آخر میں تدریس اور افتا کے صدرنشیں آپ ہی تھے۔‘‘ (ج ۸ ص ۴۹۲)

آپ کی صدارتِ تدریس کے دور میں دارالعلوم نے بہت ترقی کی اور علم وحکمت کے بڑے بڑے اساطین آپ کے فیضِ تعلیم وتدریس سے نکلے۔ آپ کے تلامذہ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب شاہ جہاں پوری، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی، حضرت مولانا سید فخرالدین صاحب مرادآبادی اور دوسرے اکابر تھے۔ رحمهم الله

حضرت شیخ الہند کے ممتاز تلامذہ میں ایک پاک نہاد اور پاک نفس بزرگ عالم حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب تھے جو دیوبند میں میاں صاحب کے لقب سے معروف تھے۔ انھوں نے اپنے استاذ کی سوانح ’’حیاتِ شیخ الہند‘‘ کے نام سے لکھی ہے۔ انھوں نے حضرت شیخ الہند کے اندازِ درس کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے کہ:

> ’’حلقۂ درس کو دیکھ کر سلفِ صالحین واکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نظروں کے

> سامنے پھر جاتا تھا۔ قرآن وحدیث حضرت کی زبان پر تھا اور ائمہ اربعہ کے مذاہب ازبر، صحابہ وتابعین، فقہا ومجتہدین کے اقوال محفوظ، تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتیں، نہ منھ میں کف آتا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو جامع الغموض بناتے۔ نہایت سہل الفاظ، بامحاورہ اردو میں اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ دریا امنڈ رہا ہے۔ یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے، ہزاروں دیکھنے والے موجود [۱] ہیں کہ وہی منحنی اور منکسر المزاج ایک مشتِ استخواں، ضعیف الجثہ، مردِ خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا، مسندِ درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے جو قوت وشوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے۔‘‘

حضرت کا درس کیا تھا علم وحکمت کا آبشار تھا، جس میں طالب علموں کو کامل اطمینان ہوجاتا ذہین وفطین طلبہ اور علما جو بڑے بڑے اساتذہ سے پڑھ کر آتے، شیخ کے درس میں مشکل مشکل سوالات کرتے، حضرت ان سوالوں کا اطمینان بخش تحقیقی جواب دیتے، اور آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبوی کے حوالے سے علوم ومعارف کا فیضان فرماتے تو طبیعتیں آسودہ ہوجاتیں اور گردنیں اعترافِ عظمت میں جھک جاتیں۔

حضرت میاں صاحب لکھتے ہیں:

> ’’مسائلِ مختلف فیہا میں ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلایل بھی نقل کرتے، لیکن جب امام ابوحنیفہ کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح، چہرے پر بشاشت، تقریر میں روانی، لہجے میں جوش پیدا ہوجاتا، دلیل پر دلیل، شاہد پر شاہد، قرینے پر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے۔ تقریر رکتی ہی نہ تھی۔ اور اس خوبی سے مذہب امام اعظم کو ترجیح دیتے کہ سلیم الطبع اور منصف مزاج لوٹ جاتے تھے۔ دور کی مختلف المضامین احادیث جن کی طرف کبھی خیال بھی نہ جاتا تھا، پیش کر کے اس طرح مدعا ثابت فرماتے کہ بات دل میں اترتی چلی جاتی اور سامعین کا دل گواہی دیتا اور آنکھوں سے نظر آجاتا کہ یہی جانب حق ہے۔‘‘

ظاہری علم وفضل کے ساتھ آپ کا باطن بھی ورع وتقویٰ، نسبت مع اللہ، صدق واخلاص اور

محبت نبوی کے حسن و جمال سے آراستہ تھا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سے بیعت و ارادت کا تعلق تھا۔ ان کے سوا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ سے بھی اجازتِ بیعت حاصل تھی۔

۱۲۹۴ھ میں اپنے استاذ گرامی قدر حضرت نانوتوی کی معیت میں حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ اسی سفر میں مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے بیعت ہوئے۔ اس سفر میں اکابر علما کی بڑی تعداد شریک تھی۔ چنانچہ حضرت گنگوہی، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی، حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی، حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری، حضرت مولانا احمد حسن کان پوری جیسے مشاہیر علما حج کے اس قافلے میں شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند نے اسی سفر میں مکہ مکرمہ میں اپنے اساتذہ کے شیخ و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے شرف بیعت حاصل کیا اور اسی سفر میں مدینہ منورہ میں اپنے اکابر اساتذہ کے استاذِ حدیث حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی سے استفادہ کیا۔

حضرت شیخ الہند بایں جلالت قدر اور علوے مرتبت نہایت منکسر المزاج اور حد درجہ متواضع تھے، فروتنی اور مسکنت ان کی طبیعتِ ثانیہ تھی۔

مدرسہ معینیہ اجمیر کے معروف عالم دین حضرت مولانا معین الدین صاحب اجمیری معقولات کے مسلم عالم تھے۔ مسلکاً علماے دیوبند سے ذرا مختلف تھے، لیکن انھوں نے حضرت شیخ الہند کی شہرت سن رکھی تھی۔ ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا تو ایک مرتبہ دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہند کے مکان پر پہنچ گئے۔ گرمی کا موسم تھا، ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، جو صرف بنیان اور تہبند پہنے ہوئے تھے۔ مولانا معین الدین صاحب نے سمجھا کہ کوئی ملازم اور خادم ہے۔ حکم دیا کہ ‘میں اجمیر سے آیا ہوں، تانگہ پر سے سامان اتار لاؤ۔’ وہ صاحب جلدی سے اتار لائے۔ مولانا نے کہا کہ ‘مجھے مولانا محمود حسن صاحب سے ملنا ہے۔’ وہ صاحب بڑے تپاک سے مولانا اجمیری کو اندر لے گئے، آرام سے بٹھایا اور کہا کہ ‘ابھی ملاقات ہوجاتی ہے۔’ مولانا اجمیری منتظر رہے، اتنے میں وہ شربت لے آئے اور مولانا کو پلایا۔ مولانا نے کہا کہ ‘مولانا محمود حسن صاحب کو اطلاع

کردیجیے۔‘ ان صاحب نے کہا کہ ’آپ بےفکر رہیں اور آرام سے تشریف رکھیں۔‘ تھوڑی دیر کے بعد وہ صاحب کھانا لے کر آئے اور کھانے پر اصرار کیا۔ مولانا اجمیری نے کہا ’میں مولانا محمود حسن صاحب سے ملنے آیا ہوں، آپ انھیں اطلاع تو کردیجیے۔‘ ان صاحب نے کہا ’انھیں اطلاع ہوگئی، آپ کھانا تناول فرمائیں، ابھی ملاقات ہوجاتی ہے۔‘ مولانا اجمیری نے کھانا کھالیا۔ ان صاحب نے انھیں پنکھا جھلنا شروع کردیا۔ جب دیر ہونے لگی تو مولانا اجمیری برہم ہوگئے اور فرمایا ’آپ میرا وقت ضایع کررہے ہیں، میں مولانا سے ملنے آیا تھا اور اتنی دیر ہوچکی ہے، ابھی تک آپ نے ان سے ملاقات نہیں کرائی۔‘ اس پر وہ صاحب بولے کہ:

’دراصل بات یہ ہے کہ یہاں مولانا تو کوئی نہیں البتہ محمود خاکسار ہی کا نام ہے۔‘

مولانا معین الدین صاحب یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ کہنے لگے ’حضرت آپ نے پہلے ہی کیوں نہ بتادیا، اتنی دیر سے میں گستاخیوں میں مبتلا ہوں۔‘ فرمایا کہ ’آپ بڑے دربار سے آئے ہیں، اگر میں ابتدا ہی میں بتادیتا تو مجھے خدمت کا یہ موقع نہ ملتا، جس کی سعادت مجھے حاصل ہورہی ہے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر باختصار)

یہ حضرت شیخ الہند کا طبعی حال تھا، وہ کبھی اپنی کوئی حیثیت نہیں سمجھتے تھے۔ بڑے تو بڑے ہیں وہ بہت چھوٹے لوگوں کی بھی خدمت اس طرح کرتے تھے جیسے وہ خود بہت چھوٹے ہوں، اور جنھیں مخدوم بنا رکھا ہے وہ بہت بڑے ہوں۔

علمی اور روحانی کمالات، زہد وتقویٰ، اخلاص وللّٰہیت اور انکساری وخدمت گزاری کے بلند احوال کے ساتھ حضرت شیخ الہند کی زندگی کا ایک روشن باب جذبۂ جہاد اور اس کے لیے عملی سرگرمیاں ہیں۔ اس سلسلے میں برسوں وہ مالٹا کی جیل میں رہے۔ یہ ایک مفصل مضمون کا موضوع ہے۔ اس کی ایمان افروز اور دلچسپ داستان ’’فیض شیخ الہند‘‘ کے کسی اگلے شمارے میں پڑھیے گا ان شاء اللہ۔

وفات:

مالٹا کی اسارت سے آپ کو جب رہائی ملی تو ۲۰؍رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۸؍جون ۱۹۲۰ء کو ایک بجے دن کو بمبئی کی بندرگاہ پر اترے۔ ۲۵؍رمضان المبارک کو دیوبند تشریف لائے اور

سیدھے مدرسے میں تشریف لے گئے۔ ۱۰؍شوال کو ایک طویل سفر فرمایا، کوڑہ جہان آباد ضلع فتح پور ہنسوہ، الٰہ آباد، غازی پور، فیض آباد، لکھنؤ، مراد آباد کا دورہ کرتے ہوئے ۲۵؍شوال کو دیوبند واپس تشریف لائے۔

ذی الحجہ میں موسمی بخار اور تپ ولرزہ کی وبا دیوبند میں پھیلی۔ محرم میں حضرت کی طبیعت خراب ہوئی۔ حضرت کو وجعِ مفاصل (جوڑوں کے درد) اور بواسیر کی تکلیف بہت پہلے سے تھی۔ مالٹا سے واپسی کے بعد یہ دونوں بیماریاں بہت بڑھ گئی تھیں، تاہم تحمل فرماتے تھے۔ چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے میں زیادہ اثر نمایاں نہیں ہونے دیتے تھے، مگر اس تپ ولرزہ نے یک بارگی اتنا ضعیف کردیا کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ یونانی اور ڈاکٹری علاج ہوا، کچھ افاقہ ہوا۔ صفر ۱۳۳۹ھ کو پھر بخار آیا اور ساتھ ہی پیچش بھی ہوگئی، ضعف اور مرض میں اضافہ ہوتا گیا۔

اسی دوران علی گڑھ تشریف لے گئے۔ واپسی میں حضرت کے عقیدت کیش ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے دہلی میں روک لیا اور نہایت توجہ اور اہتمام سے علاج ہوتا رہا۔ افاقہ ہوا، لیکن ۱۵؍ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو پھر بخار آیا اور حالت نازک ہوگئی۔ ہوش وحواس بجا تھے، آدمی پہچانتے تھے، بہت ضعیف آواز میں گفتگو بھی کرلیتے تھے۔ ۱۸؍کی شب تک یہی حالت رہی، مگر اب ایک استغراقی کیفیت کا غلبہ ہوگیا تھا۔ صبح سات بجے بہت تغیر ہوگیا، دنیا سے بالکل غافل ہوگئے، تنفس طویل اور غیر طبعی ہوگیا۔ چارپائی کے گرد حاضرین آہستگی سے ذکرِ الٰہی میں مشغول تھے۔ اسی حالت میں حضرت کی زبانِ مبارک سے باآوازِ بلند تین مرتبہ ’اللہ اللہ‘ نکلا۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا بیان ہے کہ حضرت نے تھوڑی دیر آنکھ کھول کر چھت کی طرف دیکھا پھر فرمایا کہ ’مرنے کا تو افسوس نہیں ہے، مگر افسوس یہ ہے کہ بستر پر مر رہا ہوں۔ تمنا تو یہ تھی کہ میدانِ جہاد میں میرے ٹکڑے کیے جاتے۔‘ اس کے بعد بلند آواز سے سات مرتبہ ’اللہ اللہ‘ کہا، آٹھویں مرتبہ میں زبان بند ہوگئی۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے سورہ یٰسین پڑھنی شروع کی، مگر جوشِ گریہ اور ادب کی وجہ سے بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے، اس لیے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے پڑھنا شروع کیا۔ سورہ قریب الختم ہوئی، حضرت نے خود بخود حرکت کرکے اپنا بدن سیدھا اور درست کرلیا، ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر سیدھی کرلیں۔ ۸؍بجے جب کہ مولانا محمد الیاس صاحب سورہ کے بالکل آخر پر پہنچے

تو حضرت نے ذرا آنکھ کھولی، زبان کو تھوڑی سی حرکت دی اور خاص ‘والیه ترجعون’ پر قبلہ رو ہو کر ہمیشہ کے لیے آنکھ بند کر لی اور زندگی بھر کے مجاہدوں سے دھلی دھلائی اور ذکرِ الٰہی سے سجی سجائی روح رفیق اعلیٰ میں جا شامل ہوئی۔ انا للّٰہ و انا الیه راجعون

جنازہ دیوبند لایا گیا۔ دوسرے دن نو بجے صبح کو اپنے محبوب استاذ کی پائینتی میں جگہ پائی۔ نماز جنازہ دو مرتبہ ادا کی گئی، ایک مرتبہ دہلی میں۔ اس نماز میں آپ کے ولیِ اقرب برادرِ خود مولانا حکیم محمد حسن صاحب شریک نہ تھے۔ دوسری نماز دیوبند میں حضرت حکیم صاحب کی امامت میں ادا کی گئی۔ دفن کے بعد ایک غمزدہ نے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا:

مٹی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو!
گنجینہ علوم ہے یہ گنجینہ زر نہیں

رحمه الله رحمة واسعة واکرمه وادخله الجنة بمنه وکرمه۔

❑❑❑

ایمان وروحانیت کا اختر تاباں

حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب

۱۹۷۸ء کا کوئی مہینہ تھا، ان حروف کا راقم مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد میں تدریس کی خدمت انجام دے رہا تھا، ایک روز دوستوں میں سے ایک صاحب نے بتایا کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی علیہ الرحمہ کے یہاں پاکستان سے ایک بزرگ تشریف لائے ہیں۔ بہت خوش مزاج، خندہ رو اور خندہ جبیں، خوش لباس، خوش خصال، وجیہ و دلآویز! بولتے ہیں تو تمام مجلس سراپا گوش بن جاتی ہے، منہ سے الفاظ نہیں پھول جھڑتے ہیں، گفتگو کا ایک موضوع ہوتا ہے، ذکر الٰہی، نسبت مع اللہ، نفس کا تزکیہ، قلب کی اصلاح، اللہ کی جانب توجہ، اتباعِ سنت کی اہمیت اور اس کی ترغیب۔ گفتگو کے درمیان خوبصورت اشعار بھی پڑھتے ہیں اور یہ اشعار زیادہ تر انہیں کے ہوتے ہیں۔ مثنوی مولانا روم کے بہترین شارح اور ترجمان!

موقع پا کر اس بندۂ خاکسار نے بھی خدمت میں حاضری دی، جیسا سنا تھا اس سے کچھ بڑھ کر پایا۔ ان کی تقریر بڑی موثر اور دلآویز محسوس ہوئی، قلب کا پیمانہ بادۂ محبت سے لبریز تھا، جب گفتگو چھڑتی تو محبت الٰہی اور عشقِ نبوی تک پہنچتی، ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ جب وہ ذکر الٰہی اور نسبت مع اللہ کی گفتگو کرتے تو ان پر ایک محویت کا عالم طاری ہوتا، ایسا محسوس ہوتا کہ:

بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

معلوم ہوا کہ یہ بزرگ اصلاً ہندوستان کے رہنے والے، ضلع پرتاپ گڑھ کے باشندے ہیں۔ ضلع اعظم گڑھ کے مشہور شیخ طریقت، صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری نوراللہ مرقدہ کے مرید و پروردہ، حضرت مولانا ابرارالحق صاحب ہردوئی علیہ

الرحمۃ کے خلیفہ، حضرت مولانا محمد احمد صاحب (علیہ الرحمۃ) کے ہم وطن حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب ہیں۔

اس کے بعد گاہے گاہے وہ ہندوستان تشریف لاتے رہے اور اصلاح باطن، نسبت مع اللہ، ذکر الٰہی اور ترغیب وترہیب کا نور برساتے رہے، عشق ومحبت کا جام چھلکاتے رہے۔

حضرت حکیم صاحب علیہ الرحمۃ شریعت وطریقت کے سچے سالک اور رہنما تھے۔ اللہ و رسول کی محبت میں فنا تھے، غیر اللہ کا تعلق اور غیر اللہ کی محبت انہیں گوارا نہ تھی۔ وہ جہاں ہوتے محبت الٰہی کی ندا دیتے۔ ہر فنا پذیر اور زوال آمادہ شے کی محبت سے بیزاری کا سبق پڑھاتے اور خداوند تعالیٰ کی دایمی محبت کی تلقین فرماتے۔ یہی مضمون ان کی تقریروں میں ہوتا، یہی مضمون ان کی تحریروں اور کتابوں میں ہوتا۔ اس مضمون کی گرفت نے انھیں مولانا جلال الدین رومی کی شہرۂ آفاق مثنوی تک پہنچایا اور انھوں نے مثنوی شریف کے منتخب اشعار کی اتنی خوبصورت اور جامع شرح لکھی کہ مثنوی شریف کی روح پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دی۔ یوں تو حکیم صاحب کے بہت سے مواعظ ومولفات ہیں، اور سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ مگر مثنوی شریف کی شرح ''معارف مثنوی'' کا رنگ البیلا ہے۔ جس طرح خود مثنوی شریف البیلی ہے، اسی طرح اس کی یہ شرح بھی البیلی ہے۔ تنہا یہ ایک کتاب محبت الٰہی، زہد فی الدنیا، شریعت کی عظمت، نسبت مع اللہ کی اہمیت اور بزرگوں سے تعلق ومحبت کے فیضان کے لیے کافی ہے۔

ناظرین کی واقفیت اور ضیافت طبع کے لیے معارف مثنوی کے چند اقتباسات اور مضامین اس جگہ پیش کیے جاتے ہیں۔ حضرت حکیم صاحب علیہ الرحمۃ کے دردوسوز اور حکمت و موعظت کو ان کے ذیل میں ملاحظہ فرمایئے اور نفس، باطن کے تزکیہ اور قلب وروح کے تجلیہ وتحلیہ کا سبق حاصل کیجیے۔

'ایک رات حضرت سلطان محمود شاہی لباس اتار کر عام لباس میں رعیت کی نگرانی کے لیے تنہا گشت فرما رہے تھے کہ اچانک چوروں کے ایک گروہ کو دیکھا کہ آپس میں کچھ مشورہ کر رہا ہے۔ چوروں نے سلطان محمود کو دیکھ کر دریافت کیا کہ 'اے شخص تو کون ہے؟' بادشاہ نے کہا کہ 'میں بھی تم ہی میں سے ایک ہوں' وہ لوگ سمجھے کہ یہ بھی کوئی چور ہے، اس لیے ساتھ لے لیا۔ پھر آپس

میں باتیں کرنے لگے اور یہ مشورہ ہوا کہ ہر ایک اپنا اپنا ہنر بیان کرے، تاکہ وہی کام اس کے سپرد کردیا جاوے۔ ایک نے کہا ’صاحبو! میں اپنے کانوں میں ایسی خاصیت رکھتا ہوں کہ کتا جو کچھ اپنی آواز میں کہتا ہے، میں سب سمجھ لیتا ہوں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔‘

دوسرے نے کہا کہ ’میری آنکھوں میں ایسی خاصیت ہے کہ جس شخص کو اندھیری رات میں دیکھ لیتا ہوں، اس کو دن میں بلا شک وشبہ پہچان لیتا ہوں۔‘

تیسرے نے کہا کہ ’میرے بازوؤں میں ایسی خاصیت ہے کہ میں ہاتھ کے زور سے نقب لگا لیتا ہوں، یعنی گھر میں داخل ہونے کے لیے مضبوط دیوار میں بھی ہاتھ سے سوراخ کردیتا ہوں۔‘

چوتھے نے کہا کہ ’میری ناک میں ایسی خاصیت ہے کہ مٹی سونگھ کر معلوم کرلیتا ہوں کہ اس جگہ خزانہ مدفون ہے یا نہیں، جیسے مجنوں نے بغیر بتلائے ہوئے خاک سونگھ کر معلوم کرلیا تھا کہ اس جگہ لیلیٰ کی قبر ہے۔‘

ہمچو مجنوں بو کنم ہر خاک را
خاکِ لیلیٰ را بیابم بے خطا

پانچویں شخص نے کہا کہ ’میرے پنجہ میں ایسی قوت ہے کہ محل خواہ کتنا ہی بلند ہو، لیکن میں اپنے پنجہ کے زور سے کمند کو اس محل کے کنگرہ میں مضبوط لگا دیتا ہوں اور اس طرح مکان میں آسانی سے داخل ہوجاتا ہوں۔‘

پھر سب نے مل کر بادشاہ سے دریافت کیا کہ ’اے شخص! تیرے اندر کیا ہنر ہے؟ جس سے چوری کرنے میں مدد مل سکے۔‘ بادشاہ نے جواب دیا:

مجرماں را چوں بجلاداں دہند
چوں بجنبد ریشِ من ایشاں رہند

ترجمہ: میری ڈاڑھی میں ایسی خاصیت ہے کہ پھانسی کے مجرموں کو جب جلادوں کے حوالے کردیا جاتا ہے، اس وقت اگر میری ڈاڑھی ہل جاتی ہے تو سب اسی وقت رہائی پا جاتے ہیں۔ یعنی جب میں ترحم سے ڈاڑھی ہلا دیتا ہوں تو مجرمین کو قتل کی سزا سے فی الفور نجات حاصل ہوجاتی ہے۔

یہ سنتے ہی چوروں نے کہا:

قوم گفتندش کہ قطب ما توئی
روز محنت ہا خلاص ما توئی

ترجمہ: اے ہمارے قطب! چونکہ یوم مشقت میں خلاصی کا ذریعہ آپ ہی ہیں۔ یعنی اگر ہم پکڑے جاویں تو آپ کی برکت سے چھوٹ جاویں گے، اس لیے اب ہم سب کو بے فکری ہوگئی ہے۔ کیوں کہ اوروں کے پاس تو صرف ایسے ہنر تھے جن سے چوری کی تکمیل ہوتی تھی لیکن سزا کے خطرے سے بچانے کا ہنر کسی کے پاس نہ تھا۔ یہی کسر باقی تھی جو آپ کی وجہ سے پوری ہوگئی اور سزا کا خطرہ بھی ختم ہوگیا۔ بس اب کام میں لگ جانا چاہیے۔ اس مشورہ کے بعد سب نے قصر شاہ محمود کی طرف رخ کیا اور شاہ خود بھی ان کے ہمراہ ہوگیا۔ راستہ میں کتا بھونکا تو کتے کی آواز سمجھنے والے نے کہا کہ 'کتے نے کہا کہ تمھارے ساتھ بادشاہ بھی ہے۔' لیکن اس کی بات کی طرف چوروں نے دھیان نہ دیا، کیوں کہ لالچ ہنر کو پوشیدہ کر دیتی ہے:

صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد
چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد

ایک نے خاک سونگھی اور بتا دیا کہ شاہی خزانہ یہاں ہے۔ ایک نے کمند پھینکی اور شاہی محل میں داخل ہوگیا۔ نقب زن نے نقب لگا دی اور آپس میں خزانہ تقسیم کرلیا اور جلدی جلدی ہر ایک نے مال مسروقہ پوشیدہ کرلیا۔ بادشاہ نے ہر ایک کا حلیہ پہچان لیا اور ہر ایک کی قیام گاہ کے راستوں کو محفوظ کرلیا اور اپنے کو ان سے مخفی رکھ کر محل شاہی کی طرف واپس ہوگیا۔

بادشاہ نے دن کو عدالت میں شب کا تمام ماجرا بیان کر کے سپاہیوں کو حکم دیا کہ 'سب کو گرفتار کرلو اور سزائے قتل سنا دو۔' جب وہ سب کے سب مشکیں کسی ہوئی عدالت میں حاضر ہوئے تو تختۂ شاہی کے سامنے ہر ایک خوف سے کانپنے لگا۔ لیکن وہ چور جس کے اندر یہ خاصیت تھی کہ جس کو اندھیری رات میں دیکھ لیتا دن میں بھی اس کو بے شبہ پہچان لیتا، وہ مطمئن تھا۔ اس پر خوف کے ساتھ رِجا کے آثار بھی نمایاں تھے، یعنی ہیبتِ سلطانی اور قہرِ انتقامی سے ترساں اور لطفِ سلطانی کا امیدوار تھا کہ حسب وعدہ جب مراحمِ خسروانہ سے ڈاڑھی ہل جاوے گی تو فی الفور خلاصی ہو جاوے

گی اور حسب وعدہ میں اپنے تمام گروہ کو بھی چھڑا لوں گا۔ کیوں کہ غایتِ مروت سے بادشاہ اپنے جان پہچان والے سے اعراض نہ کرے گا بلکہ عرض قبول کر کے سب کو چھوڑ دے گا۔

اس شخص کا چہرہ خوف اور امید سے کبھی زرد کبھی سرخ ہو رہا تھا کہ بادشاہ محمود نے جلالتِ خسروانہ کے ساتھ حکم نافذ فرمایا کہ ’ان سب کو جلادوں کے سپرد کر کے دار پر لٹکا دو اور چوں کہ اس مقدمہ میں سلطان خود شاہد تھے، اس لیے کسی اور گواہی کی ضرورت نہیں۔‘ یہ سنتے ہی اس شخص نے دل کو سنبھال کر ادب سے عرض کیا کہ ’اگر اجازت ہو تو ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔‘ اجازت حاصل کر کے اس نے کہا ’حضور! ہم میں سے ہر ایک نے اپنے مجرمانہ ہنر کی تکمیل کر دی، اب خسروانہ ہنر کا ظہور حسبِ وعدہ فرما دیا جائے۔ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے، آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ ’میری ڈاڑھی میں ایسی خاصیت ہے کہ اگر کرم سے ہل جاوے تو مجرم خلاصی پا جاوے۔‘ لٰہذا اے بادشاہ! اب اپنی داڑھی ہلا دیجیے، تاکہ آپ کے لطف کے صدقہ میں ہم سب اپنے جرائم کی عقوبت و سزا سے نجات پا جائیں۔ ہمارے ہنروں نے تو ہمیں دار تک پہنچا دیا، اب صرف آپ ہی کا ہنر ہمیں اس عقوبت سے نجات دلا سکتا ہے۔ آپ کے ہنر کے ظہور کا یہی وقت ہے۔ ہاں کرم سے جلد داڑھی ہلائیے کہ خوف سے ہمارے کلیجے منہ کو آ رہے ہیں۔ اپنی داڑھی کی خاصیت سے ہم سب کو جلد مسرور فرما دیجیے۔

سلطان محمود اس گفتگو سے مسکرایا اور اس کا دریائے کرم مجرمین کی فریاد و نالۂ اضطرار سے جوش میں آ گیا۔ ارشاد فرمایا کہ ’تم میں سے ہر شخص نے اپنی اپنی خاصیت دکھا دی حتی کہ تمھارے کمال اور ہنر نے تمھاری گردنوں کو مبتلائے قہر کر دیا۔ بجز اس شخص کے کہ یہ سلطان کا عارف تھا اور اس کی نظر نے رات کی ظلمت میں ہمیں دیکھ لیا تھا اور ہمیں پہچان لیا تھا۔ پس اس شخص کی اس نگاہِ سلطان شناش کے صدقے میں تم سب کو رہا کرتا ہوں۔ مجھے اس پہچاننے والی آنکھ سے شرم آتی ہے کہ میں اپنی داڑھی کا ہنر ظاہر نہ کروں۔‘

فائدہ۔۱: اس حکایت میں عبرت و نصیحت ہے کہ جس وقت تم جرائم کا ارتکاب کرتے ہو، شہنشاہِ حقیقی تمھارے ساتھ ہوتا ہے اور تمھارے کرتوتوں سے باخبر ہوتا ہے۔ ”وھو معکم این ما کنتم“ اور سلطان حقیقی تمھارے ساتھ ہے، جہاں کہیں بھی تم رہو۔

بندہ جب کسی نافرمانی کا ارتکاب کرتا ہے تو گویا خزانۂ حدودِ الٰہیہ میں خیانت کرتا ہے۔ اللہ کے حقوق کے خیانت ہو یا بندوں کے حقوق کی، یہ سب اللہ کے خزانے کی چوریاں ہیں، اس لیے ہر وقت یہ خیال رہے کہ شہنشاہِ حقیقی ہمارے ساتھ ہے اور ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اس کے سامنے خزانہ لوٹا جا رہا ہے۔ ذرا سوچو تو سہی! تم کس کی چوری کر رہے ہو؟ وہ بادشاہِ حقیقی کہہ رہا ہے کہ ہم تمھیں دیکھ رہے ہیں، ہمارا قانون تو نازل ہو چکا ہے، آج تم قانون شکنی کر لو، آج دنیا میں تو میں تمھاری ستاری کر رہا ہوں کہ شاید تم راہ پر آ جاؤ، لیکن اگر ہوش میں نہ آئے تو کل قیامت میں جب مشکیں کسی ہوئی میرے سامنے حاضر ہو گے، اس وقت میرے قہر و غضب سے تمھیں کون بچا سکے گا؟

فائدہ۔۲: اس حکایت سے یہ نصیحت بھی ملتی ہے کہ اللہ تعالی گناہوں کی سزا فی المآل یعنی آخرت میں دیں گے، اگرچہ دنیا میں فی الحال نظر انداز فرما دیں، جیسے خزانۂ شاہی کی چوری کے وقت سلطان اگرچہ چوروں کو دیکھ رہا تھا اور ان کے پاس ہی تھا لیکن اس حال میں انہیں سزا نہ دی بلکہ انجام کار گرفتار کرا لیا۔ اگر ہر روز یہ مراقبہ کر لیا جائے کہ اللہ تعالی ہمارے تمام اعمال کو دیکھ رہے ہیں تو گناہ کے ارتکاب سے خوف محسوس ہو گا۔

فائدہ۔۳: تیسری نصیحت یہ کہ قیامت کے دن کوئی ہنر کام نہ دے گا بلکہ وہ تمام اعمال جو اللہ تعالی کی مرضی کے خلاف انسان سے سرزد ہو رہے ہیں، قیامت کے دن گردن کو بندھوا دیں گے، گو دنیا میں ان کو ہنر سمجھا جاتا ہو۔ جس طرح چوروں نے اپنے فن کو موقعِ کمال میں پیش کیا تھا لیکن ان کمالات ہی نے ان کی مشکیں کسوا دیں:

ہر یکے خاصیتے خود را نمود
ایں ہنرہا جملہ بدبختی فزود

ترجمہ: ہر ایک نے اپنی خاصیت دکھائی اور اپنا کمالِ ہنر پیش کیا، لیکن ان تمام ہنروں سے ان کی بدبختی اور بڑھ گئی۔ جو ہنر جان کو خالق جان سے آشنا نہ کر دے اور دل کا رابطہ حق تعالی سے قائم نہ کر دے اور اللہ کی یاد کا ذریعہ نہ ہو جاوے، وہ ہنر نہیں ہے وبال ہے۔ انسان کی جو قوتیں اللہ تعالی سے بغاوت، سرکشی اور غفلت میں صرف ہو رہی ہیں، وہ ایک دن اس کو مجرم کی حیثیت سے اللہ تعالی کے حضور میں پیش کریں گی۔

آج دنیا کی جو قومیں سائنسی ترقی کے ذریعہ تسخیرِ مہتاب کو اپنا کمال سمجھ رہی ہیں اور اللہ سے منہ موڑ کر اپنی زندگی کے ایام گزار رہی ہیں، انھیں کل قیامت کے دن پتا چلے گا کہ ان کا یہ کمالِ ہنر قابلِ انعام ہے یا موردِ قہر و غضب؟

تسخیرِ مہر و ماہ مبارک تجھے مگر
دل میں اگر نہیں تو کہیں روشنی نہیں

فائدہ۔۴: پس معلوم ہوا کہ کوئی ہنر کام آنے والا نہیں ہے سوائے ایک ہنر کے، اور وہ یہ ہے کہ اس دنیا کے ظلمت کدہ میں اللہ کو پہچاننے والی نظر پیدا کی جائے، جیسے کہ وہ شخص جس کی نگاہ سلطان شناس تھی کہ اپنے اسی ہنر کی وجہ سے قہر و انتقامِ شاہی سے خود بھی بچ گیا اور دوسروں کے لیے بھی سفارش کی، باقی ساری خاصیتیں آلۂ سزا و عقوبت ہو گئیں۔ لیکن:

جز مگر خاصیتے آں خوش حواس
کہ بشب بود چشم او سلطاں شناس

ترجمہ: صرف اس خوش حواس کی نگاہِ سلطان سناش کام آئی جس نے رات میں سلطان کو پہچان لیا تھا۔ پس نصیحت اس میں یہ ہے کہ یہ دنیا ظلمت کدہ ہے، یہاں کی اندھیری میں جو بندہ اتباعِ شریعتِ الٰہیہ کی برکت سے اپنے اللہ کو پہچان لے گا، وہ قیامت کے دن خود بھی نارِ جہنم کی عقوبت سے خلاصی پائے گا اور دوسرے مجرمین (گنہ گار اہل ایمان) کے لیے بھی سفارش کرے گا۔ لیکن اپنی اس معرفت اور لطف حق پر مغرور نہ ہوگا بلکہ خوف اور امید کے درمیان بصد عجز و نیاز عبدیتِ شفاعت کرے گا۔ پھر حق تعالیٰ جس کے لیے چاہیں گے اس کی سفارش قبول فرما کر اپنی شان رحمت کا ظہور فرمائیں گے اور جس کے لیے نہ چاہیں گے تو از راہِ عدل اپنی شانِ قہر و انتقام ظاہر فرمائیں گے۔ پس بہت خوش نصیب ہے وہ بندہ جس نے دنیا میں رہ کر نگاہِ معرفت پیدا کر لی اور اپنے اللہ کو پہچان لیا۔ عارفین جن کی روحیں اپنے مجاہدوں اور ریاضتوں کے ذریعے آج اللہ کو پہچان رہی ہیں، کل حشر کے دن یہی عارفین اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے اور نجات پائیں گے اور ان کی سفارش گنہ گاروں کے حق میں قبول کی جائے گی۔ جس وقت کفار و مجرمین کو ان کے ہنروں کے بدولت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آگ میں داخل کیا جا رہا ہوگا، اس وقت یہ فاقہ زدہ چہرے، یہ پیوند لگے

کپڑے والے، بوریہ نشین جن کا آج مذاق اڑایا جاتا ہے، اپنے اللہ کو نگاہ بھر کر دیکھ رہے ہوں گے، اس وقت مجرمین ان پر رشک کریں گے کہ کاش دنیا میں ہم بھی انھیں کر طرح رہے ہوتے اور ان کا ہنر سیکھا ہوتا، یعنی نگاہِ معرفت پیدا کر لی ہوتی۔

فایدہ۔۵: اس حکایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کے مقبول اور نیک بندے معیارِ انسانیت کے اعتبار سے کتنا بلند مقام رکھتے ہیں۔

افسوس کہ آج جو قوم انھیں چوروں کی طرح اپنی دنیوی زندگی کی چند روزہ بہار کے وسایل و ذرایع کو ہنر سمجھتی ہے اور مادی ترقی کو اصل ترقی سمجھتی ہے اور انسانیت سے گری ہوئی تہذیب کو، مثلاً کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کو اور کاغذ سے پاخانہ کا مقام صاف کرکے، ٹب میں بیٹھ کر غسل کرنے کو، اور انھی کی طرح پاخانہ کے مقام سے ملوث گندہ پانی منہ، کان، آنکھ میں داخل کرنے کو انسانیت کی معراج قرار دیتی ہے، کیا ایسی قوم کو تہذیب یافتہ وترقی یافتہ کہا جاسکتا ہے!

افسوس صد افسوس کہ مسلمان اللہ کی پسندیدہ تہذیب و معاشرت کو ترک کر کے اسی مغضوب ومقہور قوم کی نقل کر رہے ہیں۔

دعا: اے اللہ! ہم پر کسی ایسے حکمراں کو متعین فرما جو تیرے پاکیزہ قانون کو نافذ کرے۔ اور بے پردہ پھرنے والی عورتوں کو، بے نمازیوں، شراب پینے والوں کو سزائیں دے اور جبراً وقہراً ایسے دستور نافذ ہوں کہ یہ چکلے خانے، شراب خانے، سینما خانے سب مقفل کردیے جائیں۔ آمین ثم آمین (معارف مثنوی صفحہ ۲۲۳ تا ۳۱)

سچی محبت الٰہی کی حقیقت وبرکت کا یہ کتنا موثر بیان ہے! واقعہ یہ ہے کہ حق تعالی کی حقیقی معرفت حاصل ہوجائے تو گناہوں کے خس وخاشاک کے جلنے اور دفع ہونے میں دیر نہ لگے گی۔ انسان کی تخلیق کی حکمت اسی معرفت میں پوشیدہ ہے۔ حق تعالی کا ارشاد ہے کہ: **وما خلقت الانس والجن الا لیعبدون**" میں نے انسان کو جنات کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ مشہور مفسر قرآن، حبر الامت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ '**لیعبدون**' سے مراد '**لیعرفون**' ہے، یعنی میری معرفت حاصل کریں۔ اللہ تعالی ہمیں نور معرفت سے نوازیں۔ آمین

حکایت بازرگان وطوطی محبوس:

طوطی وہ سبز رنگ کی چڑیا ہے جس کو عرف عام میں طوطا کہتے ہیں۔ (غیاث اللغات)

بازرگان کے معنی تاجر۔

ایک تاجر کے پاس طوطی تھی جو خوش آواز اور بہت خوبصورت تھی۔ تاجر نے اپنے سفرِ ہندوستان کا آغاز کیا اور ازراہِ کرم اپنے غلاموں اور کنیزوں سے دریافت کیا کہ ’تمھارے لیے ہندوستان سے کیا لاویں؟‘ اسی طرح طوطی سے دریافت کیا کہ ’خطِہ ہندوستان سے تیرے لیے کیا لاویں؟ اور تیرا کیا پیام ہے؟‘

طوطی نے کہا کہ ہندوستان میں جب کسی باغ وسبزہ زار سے گزرنا اور طوطیوں کا کوئی گروہ نظر آئے تو میرا سلام کہنا اور میرا پیام کہہ دینا:

کاں فلاں طوطی کہ مشتاق شما ست
از قضائے آسماں درحبسِ ما ست
گفت می شاید کہ من در اشتیاق
جاں دہم در ایں جا بمیرم درفراق
ایں روا باشد کہ من در سخت بند
گہ شما بر سبز گاہے بر درخت
ایں چنیں باشد وفاے دوستاں
من دریں حبس و شما در بوستاں
یادِ یاراں یار را میموں بود
خاصہ کاں لیلٰی و ایں مجنوں بود

ترجمہ: طوطی نے کہا کہ میرا یہ پیام طوطیانِ چمنستانِ ہند سے کہنا کہ فلاں طوطی تم لوگوں کی مشتاق ہے اور قضائے الٰہی سے میری قید میں ہے۔

طوطی نے کہا کہ بعد سلام میرا یہ پیام کہنا کہ کیا یہ بات تم لوگوں کے لیے مناسب ہے کہ میں تمھارے لیے تڑپتی رہوں اور تمھارے شوقِ ملاقات میں اسی طرح تڑپ تڑپ کر جان بحق

ہو جاؤں۔

اور کہنا کہ یہ کب تمھارے لیے روا ہے کہ میں سخت میں قید رہوں اور تم سب کبھی سبزہ ، کبھی درخت پر لطفِ آزادی اڑاؤ۔

کیا دوستوں کی وفاداری اسی طرح ہوتی ہے کہ میں قید میں رہوں اور تم سب باغوں میں رہو؟

دوستوں کی یاد دوست کے لیے نہایت مبارک ہوتی ہے بالخصوص جب دونوں میں تعلقات لیلیٰ اور مجنوں جیسے ہوں۔

تاجر نے اپنی مقید طوطی کی طرف سے جب ہندوستان کے ایک گروہِ طوطیاں کو یہ پیغامات سنایا تو طوطیوں نے بھی اپنا سلام اس کو پیش کیا، مگر ایک طوطی نے اس چمن میں جب یہ پیغام سنا تو اس کے جسم میں لرزہ ہوا اور شاخ سے کانپتی ہوئی زمین پر گر پڑی اور بالکل مردہ سی ہوگئی۔

تاجر اس پیغام رسانی سے شرمندہ ہوا کہ خواہ مخواہ اس غریب کی جان گئی، نہ کہتا تو اچھا تھا۔ جب تاجر تجارت سے فارغ ہو کر واپس آیا تو اپنے غلاموں اور کنیزوں میں انعامات تقسیم کیے، طوطی نے اس سے کہا کہ 'طوطیانِ بیابانِ ہند نے مجھے کیا پیغام بھیجا ہے؟ جو کچھ سنا ہو یا دیکھا ہو مجھے بتاؤ'۔

گفت گفتم آں شکایت ہائے تو
با گروہِ طوطیاں ہمتائے تو

تاجر نے کہا کہ میں نے تمھاری شکایات تیری شریک غم طوطیوں سے کہہ دیں۔

آں یکے طوطی ز دردت بوئے برد
زہرہ اش بدرید و لرزید و بمرد

ان طوطیوں میں سے ایک طوطی پر تیرے پیغام کا بہت شدید اثر ہوا، حتیٰ کہ تابِ ضبط نہ لا سکنے سے اس کا پت پھٹ گیا اور وہ کانپتی ہوئی گری اور مرگئی۔

چوں شنید آں مرغ کاں طوطی چہ کرد

ہم بلرزید و فتاد و گشت سرد

ترجمہ: جب اس طوطی نے اس طوطی کا یہ فعل سنا کہ اس نے کیا کیا، یہ بھی اسی طرح کانپتی ہوئی گر گئی اور ٹھنڈی ہوگئی۔

تاجر یہ ماجرا دیکھ کر رونے لگا کہ یہ کیا ہوا اور کیا کہا؟

اے دریغا مرغِ خوشِ آوازِ من
اے دریغا ہمدم و ہمرازِ من

تاجر نے کہا ہائے افسوس، اے خوش آواز مرغ۔ ہائے افسوس میرے ساتھی اور میرے ہمراز۔

بعد ازانش از قفس بیروں فگند
طوطیک پرید تا شاخ بلند

اس کے بعد جب تاجر نے سمجھ لیا کہ طوطی صدمہ سے مرگئی ہے تو پنجرے سے نکال کر باہر ڈال دیا۔ اور طوطی فوراً اڑ کر شاخِ بلند پر جا بیٹھی۔ تاجر نے اوپر منہ کیا اور پوچھا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ کچھ مجھ سے بھی تو بیان کر۔

طوطی نے کہا کہ 'اس طوطی نے مجھے اپنے عمل سے خود کو مردہ بنا کر یہ سبق دیا تھا کہ تیری آزادی اور رہائی کی یہی صورت ہے کہ تو مردہ ہوجا۔' اس کے بعد طوطی نے سلام کیا اور تاجر کو الفراق کہا:

الوداع اے خواجہ رفتم در وطن
ہم شوی آزاد روزے ہمچو من

طوطی نے کہا اے خواجہ! میں نے اپنے وطن کا رخ کیا، اب تجھ سے رخصت ہوتی ہوں اور خدا کرے کہ تو بھی نفس کی زنجیر اور قید و بند سے آزاد ہو جاوے میری طرح۔ (تاکہ تو بھی باغ قربِ الٰہی میں سیر کرے)

خواجہ گفتش فی امان اللہ برو
مر مرا اکنوں نمودی راہِ نو

تاجر نے کہا فی امان اللہ اے طوطی! جا اپنے وطن، مگر تو نے مجھے بھی آزادی کی راہِ نو دکھا دی۔

جانِ من کمتر ز طوطی کے بود
جاں چنیں باید کہ نیکو پے بود

تاجر نے کہا کہ میری جان کیا طوطی سے بھی کمتر ہے کہ دنیا کے قید خانے اور خواہشاتِ نفس کی غلامی کی زنجیر میں گرفتار رہے اور اللہ تعالیٰ کے باغِ قرب سے محروم رہے۔ پس جان تو ایسی ہی ہونی چاہیے جو اپنے اصل چمن کی طرف اڑ جائے اور قید سے رہا ہو جائے۔

فایدہ: مولانا کو اس واقعہ سے یہ نصیحت فرمانی مقصود ہے کہ قفس سے اس طوطی کو رہائی، تقریر اور بلند آوازی اور دعویٔ انانیت سے نہیں ملی بلکہ اپنے کو مٹانے اور فنا کرنے سے ملی۔ پس اسی طرح جو طالب طائرِ روح کو نفس اور شیطان کے قفس سے آزاد کرانا چاہے، اس کو چاہیے کہ فنا ہونا سیکھے اور طریقہِ فنائیت فانی فی اللہ سے سیکھو۔ کیوں کہ جو خود قیدی ہو وہ دوسرے قیدی کو رہا نہیں کرا سکتا۔ اور اللہ والے نفس کے قید و بند سے آزاد ہو گئے ہیں۔ پس ان کی صحبت سے دوسرے قیدی رہائی پا سکتے ہیں۔ (معارف مثنوی صفحہ ۲۰۴ تا ۲۰۷)

آدمی کن چیزوں کی وجہ سے مبتلاے مصیبت ہوتا ہے، قید و بند میں گرفتار ہوتا ہے۔ اور کن چیزوں کی وجہ سے اسے مصایب سے رہائی حاصل ہوتی ہے۔ اس کا کتنا دلآویز بیان ہے، اور کیسی عمدہ تفہیم ہے۔ اس فنائیت کو سمجھانے کے لیے مولانا روم نے ایک اور مثال بیان فرمائی ہے۔ حضرت حکیم صاحب کی شرح کے ساتھ اسے ملاحظہ فرمائیے:

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں ایک نحوی کی حکایت بیان فرمائی ہے کہ ایک نحوی صاحب دریا عبور کرنے کے لیے کشتی پر سوار ہوئے تو ملاح نے دریافت کیا کہ 'حضور! آپ کس فن کے ماہر ہیں؟' فرمایا کہ 'میں فن نحو کا امام ہوں'۔ اور کہا کہ 'افسوس تو نے اپنی زندگی کشتی چلانے میں گنوا دی، نحو جیسا فن نہ سیکھا'۔

ملاح بے چارہ خاموش رہا۔ قضاے الٰہی سے کشتی بیچ دریا میں طوفان میں پھنس گئی۔ ملاح نے اس وقت نحوی سے کہا کہ 'حضور! اب اپنے فن سے کچھ کام لیجیے کشتی غرق ہوا چاہتی ہے'۔

حضور خاموش رہے کہ اس وقت نحو کیا کام دیتا۔

پھر ملاح نے کہا ’اس وقت نحو کا کام نہیں محو کا کام ہے۔ محض نحوی بننے سے کام نہیں چلتا محوی بننے کی ضرورت ہے:

محوی باید نہ نحو ایجاں بداں
گر تو محوی بے خطر در آب راں

یہاں تو محو چاہیے نہ کہ نحو، اگر تو محوی ہے تو بے خطر پانی میں راستہ طے کر۔

آب دریا مردہ را بر سر نہد
در بود زندہ ز دریا کے رہد

دریا کا پانی مردہ کو اپنے سر پر رکھتا ہے اور زندہ غرق ہو جاتا ہے۔ یعنی اپنے کو مٹانے اور فنا کرنے سے اللہ کا راستہ طے ہوتا ہے، تکبر والے محروم اور غرقِ آبِ ہلاکت ہوتے ہیں۔

فایدہ: پس حق تعالی کے راستے میں محویت کام دیتی ہے، محض قیل قال سے کام نہیں چلتا۔ بلکہ بعض اوقات اس قیل وقال سے ناز و پندار پیدا ہو جاتا ہے، جو اہل اللہ سے تعلق پیدا کرنے میں عار کا سبب ہو جاتا ہے۔ حق تعالی اس محرومی سے محفوظ فرمائیں اور ہم کو فنائیت کاملہ عطا فرمائیں۔ آمین

فنائیت کیا چیز ہے؟ احقر نے اپنے شیخ و مرشد سے یہ سوال کیا تھا۔

ارشاد فرمایا ’اپنے کو مٹا دینا اور فنا کر دینا یا فانی فی اللہ ہو جانا۔ ان اصطلاحات کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اپنی ان مرضیات اور خواہشات کو جو اللہ کی مرضیات اور احکام کے خلاف ہوں، ترک کر دے پس اسی کا نام فنائے نفس ہے، ابتدائے سلوک میں یہ عمل مجاہدہ اور مشقت سے ہوتا ہے اور انتہائے سلوک میں مرضیاتِ الٰہیہ پر عمل کر کے ان کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے۔ (معارف مثنوی صفحہ ۲۲۱ تا ۲۲۲)

آخر میں حضرت مولانا روم کی ایک نصیحت پر اس مضمون کا خاتمہ کیا جاتا ہے۔ یہ نصیحت دنیاوی الجھنوں سے نجات، سکون دل اور تعلق مع اللہ کا ایک نسخۂ کیمیا ہے۔ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں پڑھیے اور اسے اپنا دستور العمل بنائیے۔

دربیان حصولِ رزق:

اے دویدہ سوے دکان از پگاہ — ہیں بمسجد رو بجو رزق از الہ
آنکہ او از آسماں باراں دہد — ہم تواند کو ز رحمت ناں دہد
رزق از وے جو مجو از زید و بکر — مستی از وے جو مجو از بنگ وخمر

ترجمہ وشرح:

۱۔ اے وہ شخص جو علی الصباح دوکان کھولنے کے لیے دوڑتا ہے، تجھ کو چاہیے کہ پہلے مسجد جا کر رزاقِ حقیقی سے روزی طلب کر۔ رزق کی پریشانی دور کرنے کے لیے صرف دروازۂ اسباب کو نہ کھٹکھٹا، بلکہ اسباب وتدابیر کے خالق سے رابطہ قایم کر، تاکہ مسببِ حقیقی اس سبب کو مفید نتیجہ سے ہم آغوش کردے۔ فی نفسہ اسباب وتدابیر حکمِ الٰہی کے خلاف تجھ کو کچھ مفید نہ ہوں گے، جس طرح دیوار نے کھونٹے سے کہا کہ 'تو میرا جگر کیوں پھاڑے دیتا ہے؟ مجھے اذیت نہ دے۔' کھونٹے نے جواب دیا کہ 'مجھ سے کیا فریاد کرتی ہے، اس سے فریاد کر جو مجھے ٹھونک رہا ہے۔ اگر وہ ٹھونکنا بند کر دے تو میں تیرے لیے کچھ باعثِ الم نہیں کہ مجبور بدست ٹھونکنے والے کے ہوں۔' اسی مضمون کو کسی عربی شاعر نے اس شعر میں بیان کیا ہے:

قال الجدار للوتد لم تشقنی
قال الوتد انظر الی من یدقنی

۲۔ جو ذات پاک کہ آسمان سے بارش برساتی ہے وہ قادر ہے کہ اپنی رحمت سے تجھے روٹی بھی عطا کرے۔

۳۔ رزق کو رزاقِ حقیقی سے طلب کرو، محض زید وبکر پر نظر کو محصور ومحدود نہ رکھو۔ یعنی رزق کے دروازوں سے نگاہ کو آگے بڑھاؤ اور ان تدابیر کے دروازوں سے جو ذات روزی دینے والی ہے، اس سے رابطہ قایم کرو اور استغفار کر کے اس کو راضی کرو کہ یہ کمی کسی گناہ کے سبب نہ ہو۔ اور کیفیاتِ مستی کو حق تعالی سے طلب کرو کہ انھیں کی عطا کردہ کیفیات دایمی وسرمدی اور باعثِ فلاح ہوسکتی ہے۔ بھنگ اور شراب کا نشہ تو عارضی باعثِ دردسری اور رسوائیِ دوجہاں ہے، برعکس حق تعالی شانہ کی محبت کا لطف اور اس کا نشہ۔ حضرت عارف رومی کی غزلیات میں ملاحظہ فرمائیے، فرماتے

ہیں:

ازیں مے جرعہِ پاکاں چشیدند جنید و شبلی و عطار شد مست
نہ تنہا اندریں مے خانہ مستم ازیں مے ہمچوں من بسیار شد مست

۱۔ محبت الٰہیہ کی مے (شرابِ معرفت) پاک بندے پیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ اور بابا فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ و امثالھم اسی مےِ معرفت سے مست ہوئے تھے۔

۲۔ میں ہی تنہا مے خانہ محبت الٰہیہ کا مست نہیں ہوں بلکہ مثل میرے اور بے شمار بندگانِ خدا اس نعمتِ رشکِ ہفتِ اقلیم سے باریاب ہوئے۔ (معارف مثنوی صفحہ ۵۲۵ تا ۵۲۶)

❑❑❑

ایک پیکرِ وفا کی جُدائی

مولانا محمد فاروق صاحب حیدرآباد

۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۹۰ء کا سال تھا، صفر کا مہینہ تھا، یہ خاکسار مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور میں چند ماہ قبل تازہ وارد ہوا تھا، مدرسہ اپنی تعمیر وانتظام اور تعلیم کے اعتبار سے ابتدائی مراحل سے کچھ آگے بڑھ رہا تھا۔ گاؤں کے ایک معزز فرد جو گاؤں کے پردھان بھی رہ چکے تھے اور مدرسہ کے رکن بھی تھے، ان کا جنازہ رکھا ہوا تھا، میں امامت کے لیے جنازہ کے سامنے کھڑا تھا اور پیچھے گھوم کر صفیں درست کرا رہا تھا کہ اچانک مدرسہ کے صدر دروازہ سے دو باوقار، سنجیدہ، متین اور نورانی صورتیں داخل ہوتی نظر آئیں۔ انھیں دیکھ کر طبیعت میں ایک انبساط کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ میں نے خیال کیا کہ یہ حضرات جنازہ کے قریبی لوگوں میں سے ہوں گے۔ آتے ہی وہ بھی صف میں شامل ہوگئے۔ جنازہ سے فراغت کے بعد میں قبرستان چلا گیا۔ وہاں سے واپسی پر دیکھا کہ یہ دونوں بزرگ میرے کمرہ میں تشریف فرما ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی، ادب واحترام سے ان سے ملاقات کی۔ میں نے اپنا وہ خیال عرض کیا کہ ’شاید آپ حضرات مرحوم کے قرابت داروں میں سے ہیں۔‘ فرمایا کہ ’نہیں، ہم لوگ حیدرآباد سے آئے ہیں، آپ ہی کے پاس آئے ہیں۔‘ یہ سن کر میں ان کی خاطر تواضع میں لگ گیا۔ ایک صاحب جواُن میں پستہ قد اور معمر تھے، چہرے پر سادگی اور مسکنت برس رہی تھی، لہجے میں نرمی اور حلاوت محسوس ہو رہی تھی، انھوں نے بتایا کہ ’میں محمد فاروق ہوں۔ شاید آپ کو یاد ہو دیوبند کے ایک خاص حادثہ کے بعد آپ حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ صاحب جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تشریف لائے تھے اور حضرت نے آپ کی میزبانی اور خدمت گزاری کا فرض اپنے مدرسہ کے ایک طالب علم کے سپرد کیا تھا۔ اور ایک روز کا آپ کا

قیام اس طالب علم کے کمرہ میں تھا۔ یہ بیس بائیس سال پہلے کی بات تھی، اس کا دھندلا سا نقش ذہن میں آیا۔ کہنے لگے ’وہ طالب علم میں ہی تھا‘ ان کی اس یاددہانی سے دل میں محبت کی لہریں چلنے لگیں۔ دوسرے صاحب نے بتایا کہ ’میں بکھرا ضلع اعظم گڈھ کا رہنے والا نورالدین ہوں۔ آپ کے فلاں شاگرد کا جامعہ حسینیہ جون پور میں رفیقِ درس رہا ہوں اور اسی وقت سے آپ کو جانتا ہوں۔‘

مولانا محمد فاروق صاحب نے بتایا کہ ’ہم لوگ حیدرآباد کے ایک بڑے مرکزی مدرسہ دارالعلوم حیدرآباد سے حاضر ہوئے ہیں۔ ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ مدرسہ ریاض العلوم گورینی سے سبک دوش ہو چکے ہیں تو ہمارے مدرسہ کے سرپرست اور بانی حضرت مولانا حمیدالدین عاقل حسامی صاحب نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ دارالعلوم میں چل کر تدریس کی خدمت انجام دیں۔‘ پھر انہوں نے بہت سے خطوط میرے سامنے رکھے۔ حضرت مولانا عاقل حسامی صاحب، حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب کیرانوی اور دوسرے بعض اکابر کے خطوط تھے۔ سب نے دارالعلوم حیدرآباد کی ضرورت کا اظہار کر کے مجھے وہاں جانے کا مشورہ دیا تھا۔ میں یہ بات سن کر اور ان خطوط کو پڑھ کر دیر تک تحیر آمیز سکتے میں رہا کہ کہاں ایک معمولی اور فرومایہ شخص اور کہاں اِن اکابر کی توجہات اور مہربانیاں! کافی دیر کے بعد میں نے معذرت کے انداز میں کہا کہ ’آپ نے بہت دیر کر دی، میں اب سے پانچ ماہ پہلے گورینی سے سبک دوش ہوا تھا، اگر اسی وقت مجھے معلوم ہوتا تو حیدرآباد میں اپنی حاضری کو سعادت سمجھتا۔ مگر یہاں آ جانے کے بعد ایک نیا مدرسہ جم چکا ہے اور میری دینی خدمات کا دائرہ اس چھوٹے سے گاؤں سے آگے بڑھ کر شہر تک پہنچ چکا ہے۔ وہاں تقریباً دو ماہ سے درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کر چکا ہوں، جس میں شہر کے بکثرت افراد ذوق وشوق سے حاضری دیتے ہیں اور میری طبیعت میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ اپنے وطن میں یا وطن سے قریب رہ کر جو کچھ بن پڑے دین اور تعلیمِ دین کی خدمت کروں، اس کے لیے یہ جگہ مناسب ہے۔ یہاں کی ذمہ داری کو ابتدائی حالت میں چھوڑ کر جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔‘ پھر اس موضوع پر دیر تک باتیں ہوتی رہیں، وہ حضرات اصرار کرتے رہے اور میں تواضع کے ساتھ معذرت کرتا رہا۔

یہاں سے حضرت مولانا محمد فاروق صاحب سے میرے گہرے روابط کا آغاز ہوا۔ مولانا نے دعوت دی کہ ’آپ حیدرآباد تشریف لائیں، دارالعلوم دیکھیں، حضرت مولانا حمیدالدین عاقل صاحب سے ملاقات کریں، پھر جیسا فیصلہ آپ کریں گے آپ کی مرضی ہوگی۔‘

مولانا محمد فاروق صاحب ایک مایۂ ناز سراپا حرکت وعمل، مسلسل مجاہدہ وریاضت، ایک نرم خو اور دل نواز طبیعت اور ایک دلآویز پیکرِ تواضع وانکسار شخصیت کا نام ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں جب ان کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارا تھا، اس وقت بھی یہی تاثر قائم ہوا تھا۔ پھر امتدادِ زمانی اور بعدِ مکانی اور باہم عرصہ دراز تک ملاقات نہ ہونے نے اس تاثر کو دھندلا بلکہ محو کر دیا تھا۔ ۲۰، ۲۲ر سال کے بعد ملاقات ہوئی اور مولانا نے پچھلی ملاقات کا تذکرہ کیا تو حافظہ کے نہاں خانہ سے نکل کر وہ تاثر نقشِ تازہ بن کر سامنے آ گیا۔

مولانا محمد فاروق صاحب کا طویل علالت کے بعد ۲۷ر نومبر ۲۰۱۲ء بروز سہ شنبہ انتقال ہو گیا۔ میں اس وقت ممبئی میں تھا اور سخت بیمار تھا۔ نقل وحرکت سے معذور تھا۔ دل تڑپ کے رہ گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اُڑ کر حیدرآباد پہنچ جاؤں اور اپنے محسن دیرینہ کے جنازہ میں شریک ہوں اور زندگی کے آخری حق کی ادائیگی میں اس دور افتادہ کی بھی شرکت ہو جائے۔ مگر بیماری کی زنجیر نے حرکت کی گنجائش باقی نہ رکھی تھی۔ ممبئی میں بیٹھا لیٹا دعا وایصال ثواب میں مصروف رہا اور سوچتا رہا کہ ایک طویل عرصہ جو اُن کے احسان اور اُن کی مہربانی کے سایے میں اس خاکسار نے گزارا ہے، اس کی یادیں صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دوں، مگر ضعف وناتوانی نے اس کی بھی مہلت نہ دی۔ میں سوچتا رہا کہ میں بھی تو بیمار ہوں، میرا خیال تھا میں پہلے اس دنیا سے چلا جاؤں گا، مگر میں سدا کا کاہل اور بے ہمت! اور مولانا سراپا حرکت وعمل، جن کے یہاں سستی وکاہلی کا نام ونشان نہ تھا۔ انھوں نے سبقت کی اور دوڑ کر اس بارگاہ میں سر رکھ دیا جس کے لیے ساری عمر دوڑتے رہے، بھاگتے رہے، مضطرب رہے، بے قرار رہے۔ صبح کہیں، شام کہیں، رات کہیں کا منظر تمام عمر پیش نظر رہا۔ جگر مرحوم نے شاید مولانا اور ان جیسے بزرگوں کے حال کی ترجمانی کی ہے:

جان ہی دیدی جگر نے آج پاے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

میں مولانا محمد فاروق صاحب کا تعارف کرانا چاہتا ہوں، ان کے حالات کی یاد کو محفوظ کرنا چاہتا ہوں، تمہید پر تمہید لکھتا جا رہا ہوں، لیکن قلم حیران ہے کہ وہ کہاں سے داستانِ محبت کا آغاز کرے؟ دل اس تصور سے گھبراتا ہے کہ اگر حیدرآباد جانا ہوا تو اسٹیشن پر ہوائی اڈے پر جو مسکراتا ہوا ہزاروں محبت وتسلی کا سرمایہ لیے ہوئے چہرہ نظر آتا تھا، اور جسے دیکھتے ہی سفر کی تمام تر تکان اور مشقت محو ہو جاتی تھی، اب وہ چہرہ دیکھنے کو نہ ملے گا۔

یہ تصور مضامین کے ربط کو منتشر کر دیتا ہے، لیکن قلم کو اذنِ خرام مل چکا ہے، اس لیے بے ربط ہی سہی، منتشر ہی سہی، اسے تعمیل کرنی ہے۔

مولانا محمد فاروق صاحب ان خوش نصیب افراد میں ہیں جو براہ راست کفر کی ظلمتوں سے نکل کر ایمان کی روشنی میں آئے، اور مزید خوش بختی یہ کہ مکلّف ہونے کی عمر سے پہلے ہی اسلام کے روشن ماحول میں آ گئے تھے۔ اُن کی پیدائش کفر وشرک کے گھرانے میں ہوئی تھی۔

حیدرآباد شہر سے سو کلومیٹر دور مغرب میں ایک گاؤں کِشٹا پور نامی ہے۔ وہاں ایک غیر مسلم گھرانے کے سربراہ لچھمیّا تھے۔ یہ ایک صاحبِ حیثیت شخص تھے، چھوٹے موٹے زمیندار، بااثر اور مالدار۔ سیندھی (تاڑی) کے ٹھیکے دار تھے۔ علاقے میں سیندھی کا بڑا ٹھیکہ انھیں کے دسترس میں تھا۔ وہیں گاؤں میں ایک حکیم صاحب سے ان کی دوستی تھی۔ حکیم صاحب کی صحبت اور تعلیم وتلقین سے مذہبِ اسلام سے خاصی واقفیت ہو گئی تھی۔ اسلام کی خوبیوں سے آشنا ہو گئے تھے آہستہ آہستہ دینِ اسلام کی محبت دل میں پرورش پاتی رہی۔ انھیں خیال ہوا کہ کسی بزرگ عالم دین کی خدمت میں جا کر مزید معلومات حاصل کرنی چاہیے۔ اس دور میں حیدرآباد شہر مسلمانوں کا بڑا مرکز تھا۔ اہل علم، بزرگان دین اور اہل تقویٰ کا خاصا مجمع وہاں موجود تھا۔ لچھمیّا نے سنا کہ حیدرآباد میں مولانا حسام الدین فاضل ایک بزرگ عالم دین ہیں، ان کی خدمت میں جانا چاہیے۔ مولانا کے بیانات غیر مسلموں کی ہدایت کے لیے ہوا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ گاؤں دیہات کے دورے بھی کیا کرتے تھے۔ لچھمیّا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بات کر کے بہت متاثر ہوئے۔ انھیں مولانا نے دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ لچھمیّا نے عرض کی 'میں حاضر ہوں، لیکن میرا کاروبار سیندھی کا ہے۔ اس کے ٹھیکے کی مدت ابھی چھ ماہ باقی ہے۔ اگر اس کے

ساتھ مسلمان ہونا ٹھیک ہو تو بہت اچھا ہے، ورنہ اس کے بروقت ترک کرنے میں میرا بہت نقصان ہوگا مال کا بھی، کاروبار کا بھی، عزت وآبرو کا بھی۔ مولانا نے فرمایا کہ ’یہ کاروبار ناجائز ہے، اسلام میں اس کی گنجایش نہیں ہے۔‘ انھوں نے کہا کہ ’میں اس کی مدت پوری کرنے کے بعد حاضر ہوں گا۔‘ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلے آئے، لیکن دل اٹکا رہا۔ وہ جلدی جلدی کاروبار سمیٹتے رہے۔ چھ ماہ بعد وہ اپنے بچوں کو لے کر پھر حیدرآباد آئے تو معلوم ہوا کہ مولانا حسام الدین فاضل کا انتقال ہوگیا ہے۔ انھیں بہت صدمہ ہوا۔ اب کہاں جائیں؟ کس کے یہاں جائیں؟ لوگوں نے بتایا کہ ’مولانا کے صاحبزادے مولانا حمید الدین عاقل حسامی ان کے جانشین ہیں۔‘ لچھمیّا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ مولانا عاقل حسامی گو کہ نوجوان تھے مگر بہت زیرک، سنجیدہ، سبک روح اور خوش مزاج تھے۔ انھوں نے اس خاندان کو کلمہ پڑھایا اور حلقۂ اسلام میں داخل کیا۔ لچھمیّا اپنی ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے بہت وجیہہ اور بارعب تھے۔ مولانا نے ان کا نام محمد عمر رکھا۔ ان کے بڑے بیٹے کا جو بلوغ کے قریب پہنچ رہے تھے، محمد صدیق اور ان سے چھوٹے کا محمد فاروق اور تیسرے کا محمد ابراہیم رکھا۔ یہی منجھلے صاحبزادے جو اس وقت دس بارہ برس کے تھے، اور ان کا نام ہری شنکر تھا اور اب محمد فاروق ہو چکے تھے، ہماری گفتگو کے موضوع ہیں۔

مولانا حمید الدین عاقل حسامی علیہ الرحمۃ نے اس نومسلم خاندان کی دینی تعلیم وتربیت کی کفالت کی۔ محمد صدیق کی ایک حد تک تعلیم کے بعد والد کے ساتھ ان کا دست وبازو بنا دیا اور محمد فاروق کو چاہا کہ تعلیم کی تکمیل کریں۔ چنانچہ حیدرآباد میں ابتدائی تعلیم دلانے کے بعد حیدرآباد کے طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے خلیفہ حضرت مسیح اللہ صاحب جلال آبادی کے مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد بھیج دیا۔

حضرت مولانا جلال آبادی ایک مدبر، منتظم، صاحبِ نسبت مربی ومعلم تھے۔ ان کی خدمت میں رہ کر یہ حیدرآبادی قافلہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب بن کر لوٹا۔

۱۹۷۲ء میں یہ قافلہ جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد سے فارغ ہو کر حیدرآباد لوٹا۔ اس وقت مولانا حمید الدین عاقل حسامی کی تبلیغی وتربیتی سرگرمیاں شباب پر تھیں۔ مولانا حیدرآباد کے اطراف واکناف میں بکثرت دورے کیا کرتے تھے۔ مولانا ایک نرالے انداز کے البیلے خطیب

تھے۔ شخصیت دل نواز، جاں پرسوز، دل گداز اور ظریفانہ مزاج رکھتے تھے۔ جس طرف نکل جاتے علم اور دین کے گلستان لہلہا اُٹھتے۔ ان دوروں کے لیے حضرت بہت محنت ومشقت برداشت کرتے۔ مولانا محمد فاروق صاحب فارغ ہوکر آئے تو مولانا نے انہیں اپنا رفیق بنالیا۔ وہ سفر وحضر میں مولانا کے ساتھ رہتے، استفادہ کرتے، دین کے گر سیکھتے، زندگی کو برتنے کا ہنر حاصل کرتے۔ اللہ کے لیے، دین کے لیے محنت ومشقت کے عادی بنتے۔

حیدرآباد اور اس کے مضافات میں دنیوی علم وفن کا چرچا تو کسی قدر تھا، دینی علوم سے یہ خطہ نابلد تھا۔ جہالتوں کا زور تھا، بدعات کا بازار گرم تھا، شیعیت کی وبا لہک رہی تھی۔ مسجدیں ویران تھیں، مقابر آباد وبارونق تھے۔ اللہ کو چھوڑ کر لوگوں نے اللہ والوں کو معبود بنا رکھا تھا۔ مولانا کو اپنے پراثر مواعظ کے ساتھ یہ خیال بھی رہتا تھا کہ توحید وسنت کی تعلیم وتربیت کا ایک مضبوط اور پائیدار نظام بھی ہونا چاہیے۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے رفقا کو لے کر درسگاہ کی صورت میں ایک مرکز دارالعلوم حیدرآباد کے نام سے قایم کیا۔ حالات موافق نہ تھے، ہوا تند وگرم تھی، مگر اس مردِ درویش نے دین کی ایک فانوس روشن کردی۔ مولانا نے اور ان کے رفقا نے...... جن میں دو نام بہت ممتاز ہیں۔ مولانا محمد فاروق اور جناب رحیم الدین انصاری...... جان کی بازی لگادی اور دن رات اَن تھک محنت کرکے دارالعلوم کو دینی تعلیم کا ایک مضبوط اور ناقابلِ تسخیر قلعہ بنادیا۔

دارالعلوم کے تعلیمی اور مالی استحکام کے لیے ان اساطینِ ثلاثہ نے بڑی قربانیاں دیں۔ اس کے لیے اچھے اساتذہ کو جمع کرنا، بہترین طلبہ کو اس کی طرف متوجہ کرنا، تعلیمی ترقی کے لیے اساتذہ وطلبہ کو ضروری سہولتیں مہیا کرنا، ان حضرات نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ حیدرآباد دکن کا علاقہ نوابی کے ختم ہونے کے بعد علم دین کے اعتبار سے منجمد اور بنجر ہوکر رہ گیا تھا۔ اس کو زرخیز بنانا بڑی جانکاہی کا کام تھا، لیکن مولانا کے قافلہ نے اس کا عزم کررکھا تھا۔ پڑھانے کے لیے اساتذہ کہاں ملیں گے؟ یہ ایک بڑا مسئلہ تھا۔ ان حضرات کی نگاہیں پورے ملک میں لگی رہا کرتی تھیں۔ انصاری صاحب اور مولانا محمد فاروق صاحب نے اس مقصد کے لیے بارہا حیدرآباد سے دور بہت دور یوپی اور بہار کی خاک چھانی ہے اور وہاں سے جواہر گرانمایہ کو ساتھ لے کر گئے، تاکہ وہ درس گاہ چمک اُٹھے۔ دکن میں عربی کے طلبہ نہیں ملتے تھے تو یہ حضرات داخلہ کے موقع پر دار

العلوم دیو بند اور اسکے مضافات میں جاتے اور جن طلبہ کا وہاں کسی وجہ سے داخلہ نہ ہوتا، انھیں حیدرآباد لانے کی کوشش کرتے۔ اس طرح اچھے اساتذہ اور منتخب طلبہ کی ایک خاصی تعداد مدرسہ میں جمع ہوگئی اور مدرسہ کا تعلیمی وتربیتی نظام نیک نامی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس سلسلے میں مولانا محمد فاروق صاحب اور انصاری صاحب نے قابلِ رشک محنت کی۔ اساتذہ وطلبہ کو جمع کرنے، ان کی دیکھ ریکھ کرنے، ان کی دل جوئی ودل جمعی کا اہتمام کرنے کے ساتھ ان حضرات نے ایک اور قابلِ قدر کام یہ کیا کہ ملک بھر کی عظیم دینی، علمی شخصیتوں سے ہمیشہ رابطہ رکھا۔ ان کی خدمت میں پہنچنا، انھیں تشریف لانے کی دعوت دینا، مختلف ابتدائی واختتامی تقریبات میں انھیں بصد ادب و نیاز بلانا ایک دستور سا ہوگیا تھا۔ چنانچہ ملک کی بڑی علمی ودینی شخصیت کسی نہ کسی علمی ودینی تقریب میں ان حضرات کی دعوت پر حیدرآباد پہنچیں۔ محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمیٰ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب، امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی، مفکر اسلام مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، محی السنہ مولانا ابرارالحق صاحب ہردوئی، شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب جون پوری، شیخ الادب مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی، برکۃ العصر حضرت مولانا سید صدیق احمد باندوی اور نہ جانے اَور کتنی شخصیت ہیں جو ان حضرات کی دعوت پر حیدرآباد تشریف لے گئیں اور صدہا برکات وحسنات کی باعث بنیں۔

مولانا محمد فاروق صاحب انتہائی تواضع وخاکساری کے ساتھ سراپا حرکت وعمل تھے۔ حضرت مولانا حمید الدین عاقل حسامی صاحب کے ساتھ بغایت محبت رکھنے والے ان کے تابع دار ووفادار تھے۔ دارالعلوم کی محبت میں غرق تھے۔ جاننے والے خوب جانتے تھے کہ اگر حضرت مولانا فرمادیں کہ: ’’مولوی محمد فاروق! دارالعلوم کی بھلائی کے لیے فلاں سمندر میں چھلانگ لگادو تو وہ بے تامل اس میں چھلانگ لگادیں گے۔‘‘ مولانا محمد فاروق صاحب بدن کے کمزور اور جثہ کے مختصر تھے، مگر ہمت ناقابلِ تسخیر تھی۔ دین کی خدمت کے لیے اور دارالعلوم کی ترقی کے لیے انھوں نے کبھی اپنے جسم کی کمزوری کو نہیں دیکھا۔ سفر اتنا کیا کہ سفر ہی اصل بن گیا اور حضر کا قیام ضمیمہ بن کر رہ گیا۔

ان حضرات کی اَن تھک محنت اور بے کراں جذبۂ خلوص کے نتیجہ میں جب دارالعلوم کو

استحکام حاصل ہو گیا اور اس کی تعلیم و تربیت کا قافلہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہو گیا تو مولانا محمد فاروق صاحب کی بے چین طبیعت نے اپنے آبائی علاقہ کِشٹا پور اور اس کے اطراف میں نگاہ ڈالی جہاں جہالت اب بھی خیمہ زن ہے۔ بدعات کا غلبہ ہے، دین کی شمع مدھم طور پر ٹمٹما رہی ہے۔ مولانا کے والد جناب محمد عمر صاحب نے اپنی ذاتی زمین پر ایک چھوٹا سا مکتب قایم کیا تھا، تا کہ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا نظم ہو سکے۔ وہ مکتب کمزوری کے ساتھ چل رہا تھا۔ دار العلوم کے استحکام کے بعد مولانا محمد فاروق صاحب کو خیال ہوا کہ والد کے قایم کیے ہوئے اس ادارے کو مزید ترقی دے کر علاقہ کا ایک مستحکم دینی و تعلیمی مرکز بنا دیا جائے۔ مولانا حمید الدین عاقل حسامی کی اجازت اور اشارہ پا کر مولانا نے عنانِ توجہ ادھر موڑ دی۔ یہ ادارہ مدرسہ فیض القرآن کشٹا پور کے نام سے منصۂ شہود پر ابھرنے لگا۔ مولانا ایک دُھنی آدمی، محنت اور مسلسل محنت ان کا شعار تھا۔ مقصد کے لیے فنا ہو جانا، پھر نئے سرے سے ابھرنا، اللہ نے انھیں یہ ہنر دیا تھا۔ ایک بنجر زمین میں، ایک بے آب و گیاہ سرزمین میں انھوں نے علمِ دین کا ایک گلستان لگایا اور زیادہ وقت نہیں گزرا کہ دین و علم دین کی بہار آفریں ہوائیں چلنے لگیں۔

میں دار العلوم حیدر آباد میں تو قیام نہ کر سکا، حالاں کہ مولانا نے اور انصاری صاحب نے بہت زور دیا، مگر میں اپنے آبائی علاقہ سے دور جانے پر خود کو راضی نہ کر سکا۔ لیکن مولانا کی محبت، مولانا کا جذبۂ خدمت، مولانا کا تعلقِ خاطر ایسا نہ تھا جو اپنے شکار کو آزاد کر دیتا۔ میں ان کے تیرِ محبت سے گھائل ہوا اور خوب گھائل ہوا۔ اب دستور سا بن گیا کہ سال میں ایک بار تمام مشاغل و مصروفیات کے باوجود ہفتہ عشرہ کے لیے حیدر آباد ان کی خدمت میں حاضری ہوتی ہے۔ دار العلوم حیدر آباد میں، ان کے گھر پر اور کبھی مدرسہ فیض القرآن کِشٹا پور میں قیام ہوتا۔ مولانا کے اندازِ خاکساری سے بار بار غلط فہمی ہوتی کہ شاید ان حروف کا راقم بھی تعلیم و تدریس اور خطابت کے میدان میں کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ حالی نے کیا خوب ارشاد فرمایا ہے:

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

مولانا کو میرے حیدر آباد آنے کا بڑا اہتمام رہتا تھا۔ میں پہنچتا تو مولانا بنفس نفیس

اسٹیشن تشریف لے آتے، گاڑی لے کر آتے۔ میں انھیں کہتا کہ اب آپ تشریف نہ لائیں۔ کبھی بیمار ہوتے تو اصرار کرتا کہ خود تکلیف نہ فرمائیں، صاحبزادے کو بھیج دیں مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوتے۔ ایسا کبھی نہ ہوا کہ میں پہنچا ہوں اور مولانا اسٹیشن پر تشریف نہ لائے ہوں۔ میرا اب تک کا حیدرآباد کا آخری سفر ایسا ہوا کہ مولانا بالکل صاحبِ فراش تھے، اس لیے نہ آسکے اور اس پر بار بار قلق کا اظہار کرتے تھے۔

مولانا نے بہت چاہا کہ میری تدریسی خدمات دارالعلوم حیدرآباد کے لیے وقف ہوں مگر جب ایسا نہ ہوسکا تو انھوں نے طے کیا کہ اپنے خاص خاص طالب علموں کو میرے پاس مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور اعظم گڑھ تعلیم کے لیے بھیجیں گے۔ چنانچہ اس کا آغاز انھوں نے اپنے فرزند رشید مولانا ابوعبید سلمہ سے کیا۔ مجھے شبہ تھا کہ وطن سے بہت دور، جنوب سے شمال میں جہاں کی آب و ہوا الگ، جہاں کی طرزِ رہایش جدا، جہاں کھانے پینے کا ذوق علاحدہ، حیدرآباد کے مقابلے میں آسایشِ زندگی کا فقدان، یہ بچہ کیوں کر رہ سکے گا؟ مگر مولانا اس کو اور اس کے دو ایک ساتھیوں کو نہایت اعتماد کے ساتھ لائے اور میرے حوالے کر گئے۔ مولانا کا ارشاد تھا کہ 'میں چاہتا ہوں کہ یہ بچے آپ کی تربیت سے بہرہ ور ہوں۔' اور ان بچوں نے بھی کمال کیا کہ کبھی اجنبیت کا احساس نہ ہونے دیا۔ دلجمعی سے پڑھتے رہے، محنت میں اپنے آپ کو کھپاتے رہے اور پھر دارالعلوم دیوبند جا کر انھوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ ان بچوں کا تعلق آج بھی مجھ سے قایم ہے جب کہ اب یہ بچے نہیں بلکہ حیدرآباد دکن کے ممتاز علما میں ہیں۔

حیدرآباد میں پہنچتا تو مولانا علمی اور تعلیمی حلقوں میں میرے تعارف کا بہت اہتمام کرتے۔ کبھی وہ وقت تھا کہ حیدرآباد میں مدارسِ عربیہ کا فقدان تھا، یا اب یہ کیفیت ہے کہ ان بزرگوں کی محنت، خلوص سے متعدد باوقار مدارس دینی و تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مولانا اپنی کسرِ نفسی اور تواضع و خلوص کی وجہ سے ہر حلقہ میں مقبول و محبوب تھے۔ مولانا کے انتظام میں مجھے حیدرآباد کے ہر مدرسہ میں جس کا تعلق علماے حق سے ہے، حاضری کا اتفاق ہوا۔ ہر جگہ وعظ ہوئے۔ ان مدرسوں میں محبت اور خلوص کی بڑی خوشبو پائی۔ میں نے دیکھا کہ مولانا محمد فاروق صاحب کو دین کی خدمت کی ایک دھن ہے جو انھیں ہر ایک جگہ دوڑاتی پھرتی ہے۔

کِشٹا پور کے مدرسہ فیض القرآن سے مولانا کا براہ راست انتظامی تعلق تھا۔ اس کے لیے بھاگ دوڑ کرنا، اس کی ترقی کے لیے کوشش کرنا اور اس کے لیے لگے رہنا تو خیر فطری بات تھی۔ مگر مولانا کے قلب و دماغ اور مزاج و فطرت میں وہ کشادگی تھی کہ دین کے لیے جو بھی سعیِ محمود ہوتی، دینی و تعلیمی جو کوئی بھی خدمت ہوتی، خواہ اس کا بجالانے والا ظاہری حیثیت سے کتنا ہی گمنام، یا چھوٹے نام والا ہوتا، مولانا کی ہمدردیاں، مولانا کی دعائیں، مولانا کے کلماتِ خیر اس کے ساتھ ہوتے۔ ان کے سامنے ایک ہی ادارہ یا ایک مدرسہ نہ تھا۔ وہ مجموعی اعتبار سے دین کی، علم دین کی، مسلمانوں کے معاشرے کی اور پھر فرداً فرداً ہر مسلمان کی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں محبت و اخوت کا اتھاہ سمندر محسوس ہوتا تھا۔ ان سے بات کر کے، ان سے مشورہ لے کر ہر شخص مطمئن اور مسرور ہوتا۔ ان کی یہ قلبی کیفیت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ ملاقات تو خیر ملاقات ہے، اگر ان کا فون آجاتا تو دل کی کیفیت بدل جاتی۔ محبت کا ایک سیلاب امنڈ پڑتا۔ ان کی باتیں سن کر بارہا ایسا ہوا ہے کہ دل نے آنسوؤں کی سوغات آنکھوں کی طرف اچھال دی۔

میں کس طرح بتاؤں کہ اس جثۂ مختصر میں کیسے کیسے کمالات موجود تھے۔ ان کی تواضع کے سامنے ہم جیسوں کا کبرِ نفس نہ صرف مسخر ہوتا بلکہ شرما کر رہ جاتا۔

میں ان کا مہمان ہوتا، شام کو حیدرآباد میں ہوتے، فرماتے کہ 'ایک ضرورت سے کِشٹا پور جا رہا ہوں، آپ کو چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا، مگر فلاں فلاں مجبوری ہے۔' 'تو کب آئیں گے؟' 'صبح آجاؤں گا۔' میں کہتا کہ 'صبح تک تو کِشٹا پور پہنچیں گے، پھر صبح تک کیسے آئیں گے؟' مگر صبح حیدرآباد میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے۔ راتوں رات سو کلومیٹر گئے، جس کام سے گئے تھے اسے انجام دیا اور فجر کی نماز سے پہلے یا بعد وہاں سے روانہ ہو گئے۔ یہ ایک دن کا معمول نہ تھا، ہر روز اسی طرح کا مشغلہ تھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ مولانا بہت بیمار ہیں، دل کا دورہ پڑا ہے، شفا خانے میں داخل ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ دل کا آپریشن ہونے والا ہے، بائی پاس سرجری کا کٹھن مرحلہ ہے۔ طبیعت گھبرا گئی۔ میں شمال میں، وہ جنوب میں! دعائیں کرتا رہا، حق تعالیٰ سے ان کی صحت اور زندگی مانگتا رہا۔ مولانا کے بچوں سے رابطہ رہا، پل پل کی خبر ملتی رہی۔ مجھے بے چینی تھی کہ کسی طرح خدمت میں حاضر ہوں

عیادت کا ثواب حاصل کروں۔ محبت کی قوت سے کچھ تسلی کا سامان ہو، مگر مدرسہ کی مجبوریاں، طلبہ کے اسباق کی زنجیریں سدِ راہ اور قدم گیر تھیں۔ پھر معلوم ہوا کہ مولانا صحت مند ہوکر گھر آ گئے ہیں۔ مجھے بھی کچھ موقع ملا اور میں عجلت میں حیدر آباد حاضر ہوا۔ سکندر آباد اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو مولانا محمد فاروق صاحب کا جگمگاتا چہرہ نظر آیا۔ وہی طمانینت، وہی بشاشت، وہی خوشی وانبساط جس کا جلوہ دیکھنے کا میں عادی تھا۔ سب کچھ موجود تھا، بس اتنی بات زائد تھی کہ ہاتھ میں چھڑی آ گئی تھی اور بدن تھکا تھکا معلوم ہوتا تھا، مگر حوصلہ کی توانائی میں کوئی فرق نہ تھا۔

مولانا شوگر کے مریض تھے، مگر مولانا کے دماغ ومزاج پر کسی مرض کا تسلط نہ تھا۔ وہ ہمہ دم سراپا اطمینان تھے۔ اس کا اثر یہ تھا کہ پرہیز کا زیادہ اہتمام نہ کرتے تھے۔ جب تک قوتِ مدافعت رہی، بیماری اُن سے شکست کھاتی رہی۔ پھر ایک وقت آیا کہ قوتِ مدافعت مضمحل ہوگئی، پھر بیماریوں کے ہمہ گیر اثرات جسم پر ظاہر ہونے لگے۔ گردہ متاثر ہوا، ہاتھوں پیروں پر ورم ظاہر ہونے لگا، اُٹھنا بیٹھنا دوبھر ہوگیا۔ ہسپتال میں داخل ہوتے کچھ حالات اچھے ہوتے تو باہر آ جاتے۔

ادھر کئی سال سے میری صحت گرتی جا رہی تھی، ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ میرا گردہ متاثر ہے۔ بلڈ پریشر ہائی ہے، اس کی گرفت میں دو مرتبہ فالج کا شکار ہو چکا تھا، بھوک ساقط ہوگئی تھی، متلی کا زور تھا، غذا تقریباً بند تھی۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ ڈائلیسس ضروری ہے۔ ڈائلیسس کوئی علاج نہیں، بس گردوں کی خرابی کا وہ خارجی بدل ہے۔ بدن سے سارا خون نکال کر مشین سے صاف کر کے پھر بدن میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ مجھے اس طریقۂ علاج سے وحشت تھی، میں اس تلاش میں تھا کہ کوئی یونانی حکیم ملے تو علاج کراؤں۔ معلوم ہوا کہ حیدر آباد میں ایک حکیم صاحب ہیں وہ گردے کے کامیاب معالج ہیں۔ مولانا محمد فاروق صاحب سے مشورہ کیا، انھوں نے صاد کیا۔ میں حیدر آباد حاضر ہوا۔ اب کی حاضری میں دیکھا کہ مولانا بہت مضمحل ہیں لیکن بھاگ دوڑ جاری ہے۔ بیس پچیس دن میرا قیام رہا، پھر اعظم گڑھ واپس آ گیا۔ دو ایک ماہ کے بعد پھر حیدر آباد گیا تو مولانا صاحبِ فراش ہو چکے تھے۔ میری حالت بھی اچھی نہ تھی، حکیم صاحب کے علاج سے کوئی خاص فایدہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس مرتبہ میرا قیام دارالعلوم حیدر آباد کی وسیع وعریض لائبریری کی عمارت میں تھا۔ دارالعلوم حیدر آباد کے مہتمم جناب رحیم الدین انصاری صاحب نے میرے آرام

وراحت کا عمدہ نظم کر رکھا تھا۔ اسی دوران بقرعید کا موقع آ گیا۔ مولانا محمد فاروق صاحب کی طبیعت کا اضمحلال بڑھتا جا رہا تھا۔ خود میری صحت بھی تیزی سے گر رہی تھی۔ بقرعید کے موقع پر میں جھارکھنڈ کے ضلع دیوگھر چلا گیا۔ وہاں سے اعظم گڈھ گیا، اعظم گڈھ آ کر طبیعت زیادہ بگڑی تو پھر حیدرآباد کا پروگرام بنا، لیکن حیدرآباد سے پہلے بعض خاص احباب کے اصرار سے ممبئی آ گیا۔ ممبئی میں اس حد تک طبیعت بگڑی کہ مجھے صابو صدیق اسپتال میں دوستوں نے داخل کرا دیا۔ یہاں ڈاکٹروں کی ٹیم نے متفقہ فیصلہ سنا دیا کہ ڈائلیسیس ضروری ہے۔ چنانچہ یہ عمل شروع ہوا، اس سے طبیعت میں بہتری پیدا ہوگئی، مگر میں حیدرآباد نہ جا سکا۔

اسی دوران جب میں بیماری کے سخت شکنجے میں تھا، ابھی ڈائلیسیس کا آغاز نہ ہوا تھا، نومبر ۲۰۱۲ء کا نصف اخیر شروع ہو چکا تھا۔ مولانا محمد فاروق صاحب کی شدتِ علالت کی خبریں آنے لگیں۔ میں تڑپ رہا تھا کہ میں کسی طرح حیدرآباد پہنچوں، مگر وہ حال تھا کہ سفر کا تصور بھی مشکل تھا، یہاں تک کہ ۲۷؍نومبر ۲۰۱۲ء بروز شنبہ یہ جاں گداز خبر آئی کہ مولانا کی روح قفسِ عنصری سے نکل کر اعلیٰ علیین کو پرواز کر گئی اور میں دعاے مغفرت اور ایصال ثواب کے لیے موجود رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ سفرِ آخرت میں شاید میرا نمبر آگے ہو مگر مولانا آگے بڑھ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں، ان کے درجات بلند کریں۔

مولانا کو دارالعلوم حیدرآباد سے جو تعلق تھا اس کا تقاضا تھا کہ دارالعلوم کی آغوش مولانا کے لیے کھلتی، مگر مدرسہ فیض القرآن کشتا پور کا حق تھا کہ یہ امانت وہاں سپردِ خاک ہوتی۔

طے یہ ہوا کہ جنازہ کی نماز دارالعلوم حیدرآباد کے طویل وعریض احاطہ میں ادا کی جائے جس میں عام مسلمان کے ساتھ پورا دارالعلوم اپنے عملہ کے ساتھ شریک ہو۔ چنانچہ عشا کے بعد پہلی نمازِ جنازہ احاطہ دارالعلوم میں ادا کی گئی، پھر جنازہ کشتا پور لے جایا گیا اور وہاں دوسری نمازِ جنازہ بعد نمازِ فجر ادا کی گئی اور مدرسہ کے سایۂ دیوار میں والدِ مرحوم جناب محمد عمر صاحب علیہ الرحمہ کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔

مولانا نے تقریباً ۶۰؍سال عمر پائی۔ انھوں نے عمر کا ہر لمحہ اللہ کے لیے، اللہ کے دین کے لیے، تعلیمِ قرآن کے لیے، مسلمانوں کے معاشرہ کی تشکیل واصلاح کی لیے صرف کیا۔ اپنے

بعد وراثت میں ایک بڑا دینی ادارہ چھوڑا، علم اور دین کی ترویج واشاعت کا ایک مفید ذریعہ چھوڑا، نیک اور صالح اولاد چھوڑی، جوان شاء اللہ ان کے نقش قدم پر دین کی خدمت میں سرگرم رہے گی۔ دین دار، وفادار اور عالم دین بھائی چھوڑے، جو ان کے کام کو آگے بڑھانے کی محنتوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اچھے شاگردوں کی ایک بڑی ٹیم بھی ہے، جو مختلف مقامات پر دین کی خدمت میں دل وجان سے لگی ہوئی ہے۔ مولانا کے جانے کے بعد ان سب کو سرپرست کا خلا محسوس ہو رہا ہے اور یہ فطری بات ہے، مگر ان کی تربیت کر کے وہ اس طرح سنوار گئے ہیں کہ کام کی رفتار آگے بڑھتی رہے گی ان شاء اللہ۔

اللہ تعالیٰ برکتوں سے نوازیں اور مولانا کی روح اعلیٰ علیین میں آسودہ و مطمئن ہو۔ آمین

❑❑❑

مولوی ثناء اللہ مرحوم

آج بتاریخ ۱۳؍مئی ۲۰۱۳ء بروز دوشنبہ صبح بعد نماز فجر میں قرآن کریم کی تلاوت سے فارغ ہوکر اذکار میں مشغول تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، اٹھایا تو حیدرآباد سے مولوی عبدالرحیم سلمہ بول رہے تھے۔ آواز رندھی ہوئی تھی، بتا رہے تھے کہ مولوی ثناء اللہ سونگر والے کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں گھبرا گیا، میرے وجود پر لرزہ طاری ہوگیا، ’انا للہ‘ کا وردِ ربانی زبان پر جاری ہوا۔ کیوں؟ کیسے؟ کب؟ کے سوالات بے اختیار زبان پر چل پڑے۔ موٹر سائیکل سے جا رہے تھے، کل شام کی بات ہے، کوئی جانور سامنے آگیا، اس کے بچانے میں موٹر سائیکل بے قابو ہوگئی۔ پھر کیا ہوا، چوٹ آئی، جون پور لے جائے گئے، وہاں ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ بنارس لے جائے گئے، وہاں ڈھائی بجے رات کو انتقال ہوگیا۔

اللہ کی مشیت تھی، وقت پورا ہو چکا تھا، بس اتنی بات تھی کہ عمر کی میعاد ہم کو معلوم نہ تھی، اس لیے اچانک حادثہ معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے صدمہ زیادہ ہوتا ہے۔ صدمہ ہونا تھا، ہوا اور بہت ہوا۔ آنکھیں برس پڑیں، دل دہل گیا، جسم لرز گیا اور دیر تک اندھیرا چھایا رہا۔ دعائیں کرتا رہا، دعائیں پڑھتا رہا۔ سوچتا رہا کہ کسے فون کروں کہ کچھ تفصیل معلوم ہو، کچھ تسلی ہو۔ اپنے محبوب دوست قاری شمیم صاحب کو فون کیا تو بند ملا۔ اپنے مخدوم بزرگ حضرت مولانا قمرالدین صاحب کو فون کیا تو وہ بھی صدمے سے نڈھال تھے، مگر صبر وضبط کی باتیں کرتے رہے، تسلی دیتے رہے۔

مولوی ثناء اللہ کون تھے؟ میرا ان سے کیا تعلق تھا؟ بس کیا بتاؤں! میں جب گورینی ضلع جون پور بصیغۂ مدرسی پہنچا اور یہ زمانہ ۱۹۸۵ء کا تھا تو وہ عربی سوم کے طالب علم تھے۔ میرے پاس ان کا مختصرالقدوری کا سبق تھا۔ دبلے پتلے، تیز طرار، ذہین وفطین، بہت صاف اور صحیح عبارت پڑھنے والے طالب علم سے سابقہ پڑا۔ اس کے ساتھ نیک اور سنجیدہ بھی۔ میں بہت متأثر ہوا، اس

نے بہت جلد میرے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ یہ جماعت مجموعی طور پر اچھی تھی، کئی طلبہ بہت ذہین تھے اور ساتھ ہی نیک بھی تھے۔ اسی جماعت میں مولوی عبدالرحیم بھی تھے، جنھوں نے فون سے اس جاں گداز حادثہ کی خبر سنائی۔ ان دو طالب علموں نے اپنی مزاج کی خوبی اور حسنِ استعداد کی وجہ سے میرے ساتھ بہت اختصاص حاصل کر لیا تھا۔

مولوی ثناء اللہ گورینی سے چند میل کے فاصلہ پر بجانب مشرق سونگر کے رہنے والے تھے۔ سونگر کے نام سے میں پہلے سے واقف تھا، سلسلہ قلندریہ کے ایک مرکزی شیخ و بزرگ حضرت قطب بینائے دل کی قدیم زمانہ میں یہاں خانقاہ تھی۔ ان کا تذکرہ قلندری سلسلہ کی تاریخ میں میں پڑھ چکا تھا۔ اسی ضمن میں سونگر کا نام ذہن میں محفوظ تھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ مولوی ثناء اللہ سونگر کے رہنے والے ہیں تو مجھے سونگر دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ چنانچہ ان کے ساتھ بارہا وہاں جانے کا اتفاق ہوا اور صدیاں گزر جانے کے بعد ان بزرگ کے برکات و کرامات کا مشاہدہ ہوا۔

مولوی ثناء اللہ کے والد محمد زبیر صاحب بہت نیک اور با اخلاق انسان تھے۔ ان سے بھی تعلق بڑھا اور اتنا بڑھا کہ وہ مجھے اپنے گھر کا ایک فرد شمار کرنے لگے۔ وہ بکثرت مدرسے میں مجھ سے ملنے آتے اور بکثرت مجھے اپنے گھر بلاتے۔

وہ ایک بڑے کاشتکار تھے، اپنی کاشتکاری میں میرے گھر کا حصہ ضرور لگاتے اور یہ سلسلہ ان کی زندگی بھر جاری رہا۔ ان کی اہلیہ بھی اس کا بہت اہتمام کرتیں۔ ان کے وصال کے بعد مولوی ثناء اللہ نے یہ سلسلہ بڑی مضبوطی کے ساتھ جاری رکھا، حالانکہ میں اب گورینی سے سو کلومیٹر دور شیخوپور آ چکا تھا، مگر یہ وفاداری کی وہ پابندی تھی جو اہلِ توفیق ہی کو حاصل ہوتی ہے۔

۱۹۹۰ء میں میں شیخوپور آ گیا۔ اس سال مولوی ثناء اللہ کو دیوبند جانا تھا، وہ گھبرائے ہوئے تھے کہ دیوبند کی کڑی آزمائش میں دیکھیے داخلے کی سعادت ملتی ہے یا نہیں؟ تیاری کے سلسلہ میں کچھ وقت کے لیے میرے گھر آ کر رہے۔ بار بار دعا کراتے رہے، جان توڑ محنت کرتے رہے۔ میں تسلی دیتا رہا مگر امتحان کا مرحلہ جاں گسل ہوتا ہی ہے۔ ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ میں دارالعلوم داخلہ کے لیے گیا ہوں اور میرا داخلہ ہو گیا ہے۔ اس خواب کے بعد ثناء اللہ کا خط آیا کہ 'داخلہ کے لیے دعا فرمائیں'۔ میں نے لکھا کہ 'مطمئن رہو، میرے ہر طالب علم کا داخلہ ہو گا

ان شاءاللہ۔‘ چنانچہ وہی ہوا، اس سال میرا کوئی طالب علم داخلہ میں ناکام نہیں ہوا۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مولوی ثناءاللہ نے کارِ تدریس سنبھالا۔ مانی کلاں کے مدرسہ ضیاء العلوم میں پڑھاتے رہے۔ پھر میرے اور ان کے جلیل القدر استاذ حضرت مولانا افضال الحق صاحب نے انھیں دارالعلوم گورکھ پور بلا لیا اور وہاں انھوں نے استاذ محترم کے زیر سایہ کئی سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔

وہ اپنے والد کے اکیلے بیٹے تھے، جب تک والد صحت مند رہے، گھر کے انتظام کو سنبھالتے رہے۔ پھر بیمار ہوئے اور بیماری میں جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تو مولوی ثناءاللہ کو مجبوراً گھر پر قیام کرنا پڑا۔ اب کھیتی باڑی کو یہ سنبھالنے لگے، ساتھ ہی گاؤں کے دینی مکتب کا انتظام ان کے کندھوں پر پڑا، جسے یہ بخوبی انجام دیتے رہے۔ کچھ عرصہ کے لیے بھدوہی میں بھی انھیں خدمات کے سلسلہ میں رہے، لیکن ادھر کافی عرصہ سے گھر پر ہی مکتب کی دیکھ ریکھ میں مشغول رہے۔ اس پورے عرصہ میں مجھ سے جو ربط و تعلق قایم ہوا تھا، وہ مسلسل باقی رہا بلکہ اس میں استحکام بڑھتا ہی رہا۔ ہر کچھ دنوں کے بعد شیخوپور آتے، فصل کی پیداوار لاتے۔

میں اپنی بیماری کے سلسلہ میں پانچ چھ ماہ سے بمبئی میں ہوں، یہاں بھی رابطہ رہا۔ ابھی وفات سے ایک ہفتہ پہلے ان کا فون آیا تھا کہ ’ارادہ کر رہا ہوں کہ بمبئی آپ کی خدمت میں آؤں‘۔ میں منتظر تھا کہ ان کے آنے سے مجھے خوشی حاصل ہوگی، مگر آہ کیا معلوم تھا کہ ان کے آنے کی خوشی کے بجائے حادثۂ جانکاہ کی خبر آئے گی اور تڑپا جائے گی۔

بہت نیک، سعادت مند عالم دین تھے۔ گھر کی مجبوریوں کی وجہ سے زیادہ تر انھیں گھر رہنا پڑا، مگر دینی خدمت کا تسلسل باقی رہا، دینی خدمات ہی سے وابستہ رہے۔

اللہ ان کی مغفرت فرمائیں۔ اولاد میں بیٹا اور چند بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالی انھیں سلامت با کرامت رکھیں، ان کی بہترین کفالت فرمائیں۔ اہلیہ پر بیوگی کا صدمہ ٹوٹ پڑا ہے، حق تعالی اپنی مدد سے نوازیں۔ آمین

❑❑❑

حافظ محمد عیسی صاحب علیہ الرحمہ

عیسوی سن غالباً ۱۹۶۲ء تھا، میں نے مکتب کا درجہ پانچ امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ گاؤں کی تعلیم کی تکمیل ہو چکی تھی، اب آگے تعلیمی سلسلہ کیا ہو؟ کچھ حیص بیص کے بعد طے ہوا کہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں عربی کی تعلیم حاصل کرنی ہے۔ میں نے فارسی اور عربی کی بالکل ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے گاؤں بھیرہ میں استاذ محترم مولانا عبدالستار صاحب کی خدمت میں کر دیا تھا۔ اس وقت احیاء العلوم کا گاؤں میں بہت چرچا تھا۔ وہاں کے ناظم مولانا عبدالباری صاحب علیہ الرحمہ گاؤں کی محبوب ترین شخصیت تھے۔ وہاں کے صدرالمدرسین حضرت مولانا مفتی محمد یاسین صاحب علیہ الرحمہ علاقہ کے سب سے مستند اور معتبر عالم و مفتی تھے۔ احیاء العلوم میں پڑھنا خود ایک زبردست دلیلِ استناد تھی۔ اس وقت گاؤں کے چند طلبہ احیاء العلوم میں زیر تعلیم تھے اور گاؤں میں ان کا ایک خاص وقار تھا۔ عربی میں مولانا شمس الحق صاحب جو اَب جوگیشوری ممبئ میں ممتاز عالم ہیں، درجہ حفظ میں حافظ نور الہدی صاحب، حافظ عبدالحی صاحب اور حافظ محمد عیسی صاحب زیر تعلیم تھے۔

مولانا شمس الحق صاحب عربی پنجم کی تکمیل کر کے دارالعلوم دیوبند جانے والے تھے اور تینوں حفاظ حفظ کی تکمیل کر کے گاؤں میں آ کر تراویح کے لیے الگ الگ مسجدیں آباد کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔

ان تینوں میں حافظ محمد عیسی عمر میں بھی اور شکل میں بھی چھوٹے تھے مگر قرآن کی قرأت میں فائق تھے۔ حافظ محمد عیسی کو اللہ نے بہت عمدہ گلا عطا فرمایا تھا، آواز بھی بہت اچھی تھی۔

حافظ محمد عیسی ہمارے گاؤں کے اس وقت کے مشہور و معروف قوال محمد موسی صاحب کے بڑے فرزند تھے۔ محمد موسی کی قوالی مشہور تھی، قوالی کی دنیا میں وہ بہت نامور تھے۔ ان کے ساتھ ایک

اور قوال عبدالکریم صاحب تھے۔ ان دونوں کی وجہ سے گاؤں میں اکثر قوالی کی محفلیں جمتی تھیں اور ان کی وجہ سے سرکاری چھوٹے بڑے عہدیداروں کی آمدورفت بہت ہوا کرتی تھی۔ جب بھی کوئی عہدیدار قریبی تحصیل محمد آباد سے، ضلع اعظم گڑھ سے یا کمشنری گورکھ پور سے آتا تو گاؤں میں محمد علی پردھان کی سرکردگی میں قوالی کی محفل جمتی۔

گلے اور آواز کے اعتبار سے محمد عیسی اپنے والد محمد موسی کے خلف نہیں نعم الخلف تھے۔ آثار بتاتے تھے کہ اس میدان میں وہ اپنے والد سے بازی مار لے جائیں گے۔ بچپن میں ہارمونیم ایسی بجاتے تھے کہ کہنہ مشق بجانے والے انگشت بدنداں ہوجاتے تھے۔

لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ محمد موسی صاحب کو کسی نے سمجھایا یا خود اللہ ہی نے رہبری فرمائی، انھوں نے طے کیا کہ میں اپنے بیٹے کو اس لائن میں نہیں لگاؤں گا۔ بہت سی مخالفتوں کے باوجود انھوں نے اپنے بیٹے کو جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں درجہ حفظ میں داخل کردیا اور پھر پلٹ کر انھیں قوالی اور ہارمونیم کی طرف آنے نہیں دیا۔

حافظ محمد عیسی جب حفظ کی تکمیل کے بعد گاؤں میں آئے تو ان کی تراویح کی دھوم مچ گئی اور پھر اس کا اثر یہ ہوا کہ والد نے بھی قوالی سے توبہ کرلی، نمازوں کے پابند ہوگئے، چہرے پر خوبصورت سی داڑھی آگئی۔ پھر ایسے نیک ہوئے کہ ولیوں جیسے احوال سے آراستہ ہوگئے۔ میرا بچپن تھا ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا بہت موقع ملتا تھا۔ اتنی اچھی اور پیاری باتیں، اتنے اچھے اور پیارے انداز میں کرتے کہ طبیعت بے اختیار ان کی طرف کھنچتی۔

ان کی خاص خوبی جو اور خوبیوں کے ساتھ میں نے خصوصیت کے ساتھ محسوس کی، یہ تھی کہ وہ کسی کے نام میں حذف واختصار سے کام نہ لیتے تھے اور نہ اس میں ترمیم وتغیر کرتے تھے۔ جب کہ ہمارے اطراف کے ماحول میں اس کا عام رواج تھا۔ نام ہے ’افتخار احمد‘ مگر پکارنے والے صرف ’افتخار‘ یا ’تخار‘ کہتے، اور بگاڑتے تو ’تخرا‘ کہتے۔ نام ہے ’عبداللہ‘ مگر بولنے والے ’عبدل‘ کہتے یا ’دُلّا‘ کہتے۔ نام ہے ’محمد اقبال‘ مگر زبانوں پر ’اِقبلُوا‘ جاری ہوتا۔

میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ناموں میں اس طرح کا کوئی تصرف انھوں نے کیا ہو۔ ان کے متعدد بیٹے ہیں: محمد عیسی، محمد یحییٰ، محمد یونس، محمد یوسف۔ ہر ایک کو پورے نام سے یاد کرتے۔

اس کا خوش گوار اثر یہ ہوا کہ پورے گاؤں میں انھیں پورے ناموں کے ساتھ یہ صاحبزادگان معروف ہوئے۔ اگر کوئی ان ناموں کے کسی جز میں حذف واختصار سے کام لیتا تو پہچاننا مشکل ہوتا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مجھے انھوں نے کبھی صرف ‘اعجاز’ یا ‘اِعْجزوَا’ کے نام سے نہیں پکارا، جب نام لیتے تو پورا نام ‘اعجاز احمد’ لیتے۔ میں نے بارہا اپنے والد صاحب سے اسی دور میں ان کی اس خوبی کا ذکر کیا تو والد صاحب فرماتے کہ ‘یہ ان کی بڑی خوبی ہے۔’

محمد موسی صاحب کی دوسری خوبی جس کا میں نے مسلسل مشاہدہ کیا، یہ تھی کہ وہ کسی کی غیبت نہیں کرتے تھے۔ کسی برائی اور کسی عیب کے ساتھ کبھی کسی کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اگر کچھ بولتے تھے تو خوبی ہی بیان کرتے تھے، ورنہ خاموش رہتے: ”من کان یومن باللہ والیوم الآخرۃ فلیقل خیراً او لیصمت“ کے ایک دل آویز مصداق تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ‘جو کوئی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہیے کہ اچھی بات بولے ورنہ خاموش رہے۔’

زندگی کے نرم گرم دن سب پر آتے ہیں۔ حافظ محمد عیسی اور ان کے گھرانے پر بھی آئے، مگر جس خوبی کے ساتھ وہ ہر طرح کے دنوں کو گزار لے گئے، اللہ کا ان پر بڑا احسان رہا۔

یہ خاندان مالی اعتبار سے بہت خوش حال نہیں تھا۔ ایک مرتبہ تنگی بڑھی تو حافظ صاحب کو خیال آیا کہ گھر چھوڑ کر باہر نکلنا چاہیے۔ واقف کاروں کے مشورے اور رہنمائی میں وہ افریقہ کے ایک چھوٹے سے ملک یوگنڈا جا پہنچے، جہاں غالباً رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے قرآن کی تعلیم کی خدمات پر مامور ہوئے۔ اس سے ان کی مالی حالت اچھی ہوگئی اور انھوں نے والدین اور بھائیوں کی اچھی خدمت کی۔ کئی سالوں کے بعد وہاں سے واپسی ہوگئی اور پھر گھر پر ہی رہ گئے۔ تعلیم قرآن کے مشغلے میں لگے رہے۔ خوش حالی کا معیار نیچے اتر گیا تھا، مگر ہمیشہ خوش وخرم اور اللہ کی تقدیر پر راضی رہے۔

قرآن سے انھیں بہت شغف تھا، بہت اچھی قرأت تھی۔ میں ۱۹۷۰ء میں رسمی تعلیم سے فارغ ہو کر گھر آیا اور مشیتِ خداوندی ایسی کہ مجھے ڈیڑھ دو سال گھر رہنا پڑا، تعلیم وتدریس کے سلسلہ میں کہیں جانا نہ ہوا تھا۔ فرصت کے ایام میں قرآن کریم کے حفظ کی سعادت میں سرگرم ہوا،

ساتھ ہی ایک پروگرام بنایا۔ اس وقت گاؤں میں نوجوان حفاظ کی اچھی خاصی ٹیم موجود تھی، کچھ جامعہ عربیہ احیاء العلوم سے فارغ ہوکر آئے تھے، کچھ گاؤں میں بزرگ استاذ حضرت حافظ احمد کریم صاحب علیہ الرحمہ کی درس گاہ سے حفظ کی دولت سے مالا مال ہوئے تھے۔ ان سب کے سامنے ایک منصوبہ رکھا کہ ’آپ لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور اچھا پڑھتے ہیں۔ حافظ بھی ہیں لیکن اس کا معنی و مطلب نہیں سمجھتے۔ ایسا کریں کہ ایک وقت نکال کر اس موضوع پر محنت کی جائے۔‘ نوجوان حفاظ نے بڑی خوشی اور بڑے جذبہ کے ساتھ اس منصوبہ کو قبول کیا۔ مغرب کے بعد کا وقت اس کے لیے مقرر کیا گیا۔ میں نے پارۂ عم کا ترجمہ شروع کرایا، اس طرح کہ عربی کے موٹے موٹے قواعد اور الفاظ کے ترجمے یاد کرائے، پھر آیات کے ترجمے یاد کرائے۔ اس میں محنت تو بہت کرنی پڑی اور وقت بھی بہت لگا، مگر حفاظ کرام کو عم پارہ کا نہ صرف ترجمہ ازبر ہوگیا بلکہ ہلکی پھلکی ترجمہ کی شدبد بھی حاصل ہوگئی۔ اس جماعت کے خواص میں حافظ نورالہدی صاحب، حافظ محمد عیسی صاحب، حافظ عبد الحی صاحب، حافظ حفیظ الرحمان صاحب، حافظ ابو بکر صاحب، حافظ عزیزالرحمان صاحب اور دوسرے متعدد حفاظ بلکہ غیر حفاظ بھی شامل تھے۔

یہی وہ نسبت تھی کہ ان میں سے اکثر مجھ سے عمر میں بڑے تھے، مگر انھوں نے ہمیشہ میرا میری حیثیت سے بہت زیادہ احترام کیا۔ آج بھی اس پوری جماعت کا معاملہ میرے ساتھ یہی ہے۔ اس جماعت میں سے دو پروردگار کے حضور میں حاضر ہوچکے ہیں: ایک حافظ نورالہدی صاحب کے بڑے بھائی جناب عبدالقادر صاحب......اللہ انھیں غریق رحمت کرے......عبدالقادر بھائی عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے، اتنے بڑے کہ ان کے بڑے صاحبزادے میرے ہم عمر ہیں۔ مزاج میں دین داری راسخ تھی۔ نماز با جماعت کے بہت پابند تھے۔ ہمیشہ صفِ اول میں امام کے ٹھیک پیچھے رہا کرتے تھے۔ تبلیغی جماعت کے بڑے شیدا تھے۔ میں پڑھ کر فارغ ہوکر آیا تو مجھ سے ٹوٹ کر محبت کی اور میرے ساتھ وہ معاملہ کیا کہ میں ان کے گھر کا ایک فرد ہوکر رہا۔ یہی معاملہ حافظ محمد عیسی صاحب کے ساتھ بھی تھا۔ ان کی دوستی حافظ نورالہدی صاحب کے ساتھ ایسی تھی کہ دونوں سگے بھائی معلوم ہوتے تھے۔ دونوں کی باہمی محبت میں کبھی فرق نہیں آیا اور عبدالقادر بھائی ہم تینوں کے سرپرست تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار عبدالقادر بھائی مجھ سے کسی وجہ سے

ناراض ہوگئے تھے، میں نے بھی زیادہ فکر نہیں کی۔ عبدالقادر بھائی کے مزاج میں شدت تھی، اس کی وجہ سے وہ عرصہ تک کٹے کٹے رہے۔ مگر دل میں محبت تھی، اس لیے اس عرصہ میں کبھی نہیں سنا کہ انھوں نے میری کوئی شکایت کی ہو۔ میرے دل میں بھی ان کی محبت تھی، اس لیے دل میں خلش رہا کرتی تھی۔ اس دوران میرے بہت عزیز ساتھی مولانا محمد عامر مبارک پوری علیہ الرحمہ کے انتقال کی خبر آئی، میرے دل پر اس کا بہت اثر ہوا۔ میں سوچنے لگا کہ ہار کی لڑی میں سے ایک موتی گر گیا اور اللہ جانے اپنا نمبر کب آجائے۔ عبدالقادر بھائی جیسے محبّ ومحبوب سے انقطاع مناسب نہیں ہے۔ میں نے حافظ نورالہدی اور حافظ محمد عیسی کو ساتھ لیا اور تھوڑی سی مٹھائی لی اور بے تکلف ان کے گھر جا کر آواز دی۔ وہ نکلے۔ میں نے کہا ’جو کچھ ہوا وہ ہوا، اب سب خطا معاف، یہ مٹھائی کھائیے اور صلح کیجیے۔‘ وہ بھی اتنے صاف دل کہ سب کچھ بھول گئے اور پھر تعلق ومحبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

عمر کے اخیر حصے میں وہ فالج کا شکار ہوئے اور سالہا سال تک معذوری کے ایام میں بسر کیے، مگر نماز اور ذکر دونوں کی بڑی پابندی رہی۔ جب تک ممکن رہا گھسٹ کر مسجد جاتے تھے، جب بالکل مجبوری ہوگئی تو گھر میں محصور ہو کر رہ گئے۔ بارہ چودہ برس پہلے انتقال ہوا۔ اللہ تعالی مغفرت فرمائیں، بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔

دوسرے اب حافظ محمد عیسی صاحب رخصت ہوئے۔ حافظ محمد عیسی صاحب بعض اعتبار سے اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔ حافظ صاحب تھے تو بہت خوب آدمی، لیکن فطری طور پر حافظہ ان کا کمزور تھا۔ ابھی بات سنتے اور ابھی بھول جاتے۔ کچھ غائب دماغی کی بھی کیفیت رہا کرتی تھی۔ اس وقت کی بات ہے جب وہ نوجوان تھے۔ مسجد میں عصر کی نماز کے لیے ہم لوگوں کے بزرگ استاذ مولانا عبدالستار صاحب وضو کر رہے تھے۔ حافظ محمد عیسی وضو کر چکے تھے۔ استاذ نے ان سے فرمایا کہ ’اذان پکار دو۔‘ حافظ صاحب مسجد کے صحن کے کنارے اذان پکارنے لگے۔ مولانا نے زور سے پکارا ’ہاں ہاں، یہ کیا؟‘ دیکھا کہ وہ پورب رخ کر کے اذان کہہ رہے تھے، ٹوکنے کے بعد انھیں تنبہ ہوا۔

ایک مرتبہ کسی خاص سبب سے کئی ہفتے وہ میرے ساتھ رہے۔ رات کو میرے گھر ہی وہ

سوتے رہے۔ میں سویرے اٹھتا، فجر کی نماز کے لیے ان کو اٹھاتا، اس وقت وہ نیند کے ماتے تھے۔ کئی روز تک ایسا ہوا کہ میں جگا کر مسجد چلا جاتا، وہ سوئے رہ جاتے۔ میں فجر کی نماز پڑھ کر واپس آتا تو پھر انھیں جگاتا۔ وہ جلدی سے اٹھتے اور وضو کر کے نماز ادا کرتے، قضا نہ ہوتی۔ نماز کے لیے میری چٹائی بچھی رہتی جس پر میں سنن و نوافل پڑھتا۔ ایک دن میری نگاہ پڑی تو دیکھا کہ وہ اتر جانب رخ کر کے نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں نے پکارا کہ ’یہ کیا؟‘ پھر انھوں نے بجانبِ قبلہ نماز پڑھی۔ میں کہا ’اپنے وطن میں رہتے ہوئے قبلہ کیوں کر خطا ہو جاتا ہے؟‘ کہنے لگے ’میں کئی روز سے اسی طرح پڑھ رہا ہوں۔‘ مجھے حیرت ہوئی۔ یہ ان کی غائب دماغی کا حال تھا۔ ایسا کبھی کبھی ہوتا مگر یہ ایک مزاجی کیفیت تھی۔

تاہم قرآن کریم کا معجزہ تھا اور اللہ کا فضل کہ وہ خوب یاد تھا۔ بسا اوقات تراویح میں کہیں لقمہ کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، مسلسل پڑھتے اور اچھا پڑھتے۔

بہت دنوں تک جہانا گنج مولانا عبدالرب صاحب کے مدرسہ انوار العلوم میں حفظ کے استاذ رہے۔ کچھ دنوں چریا کوٹ میں یہ خدمت انجام دی۔

اپنے گاؤں بھیرہ میں مدرسہ تعلیم القرآن کا اِجرا ہوا تو اس کے ناظم مقرر کیے گئے۔ ادھر کئی سال سے ان کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ گردے میں پتھری ہوگئی تھی، اس کا آپریشن کرایا۔ پھر بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا۔ جاڑوں میں فالج کا اثر ہوا، علاج ہوتا رہا، مگر طبیعت میں سدھرنے کے آثار نہ تھے۔ جاڑا اس سال بہت شدید پڑا تھا، اس کو تو جھیل گئے۔ گرمی آئی تو سہارے سے کچھ چلنے لگے تھے۔

میں بمبئی میں علاج کی غرض سے کئی ماہ سے مقیم ہوں۔ اچانک پورہ معروف سے حاجی محمد نعمان کا فون آیا کہ ’حافظ محمد عیسی صاحب کا انتقال ہوگیا۔‘ اب اس طرح کی خبر سن کر اپنی موت دکھائی دینے لگتی ہے۔ بس وہ کیفیت ہے:

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

حافظ نورالہدی صاحب نے دو خاص باتیں بتائیں۔ ایک یہ کہ وفات سے ایک روز پہلے انھیں فکر ہوئی کہ بھائیوں میں سے کسی ایک سے کچھ شکر رنجی چلی جا رہی تھی۔ عرصہ کی اس بیماری

میں انھوں نے خاص توجہ نہ کی تھی۔ حافظ صاحب کو فکر ہوئی کہ یہ قضیہ ختم ہو۔ حافظ نورالہدی صاحب اور مولانا جاوید اختر صاحب نے جاکر ان کے بھائی کے سامنے یہ بات رکھی۔ بھائی نے بات مان لی۔ انھوں نے آکر قصور کی معافی مانگی۔ حافظ صاحب نے خوش دلی سے سب معاف کردیا۔ حافظ نورالہدی نے کہا کہ ’اب کسی کی معافی کا انتظار نہ کیجیے، سب کو جس سے بھی کچھ معاملہ رہا ہو، دل سے معاف کردیجیے۔‘ حافظ صاحب نے یہ بات بہت خوشی سے تسلیم کرلی اور جس سے بھی کوئی معاملہ رہا، انھوں نے دل صاف کرلیا۔

دوسرے یہ کہ جس رات انتقال ہوا، ۸/ بجے تک خوب اچھی طرح باتیں کرتے رہے۔ ۸/ بجے کے بعد سینے میں درد شروع ہوا، بھائی کو بلایا جو کہ حافظ ہیں اور کہا کہ ’میرے سینے میں عجیب سا درد ہو رہا ہے، اب میں اس سے بچنے والا نہیں ہوں، سورہ یس پڑھو۔‘ بھائی کو خیال ہوا کہ یہ درد کبھی کبھی اس سے پہلے بھی ہوا ہے، انھوں نے سوچا کہ ڈاکٹر کو بلا لاؤں۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے، تب حافظ صاحب نے خود ہی سورہ یس کی تلاوت شروع کردی۔ گھر کی عورتوں نے دیکھا تو انھیں حیرت ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی درد ہوتا تھا تو کراہتے تھے، آہ آہ کرتے تھے، آج کیا بات ہے کہ پرسکون ہیں اور تلاوت کیے جارہے ہیں۔ ان کی تلاوت پوری ہوئی، اتنے میں بھائی آگئے۔ انھوں نے حالت غیر دیکھی تو سورہ یس شریف پڑھنا شروع کیا، چند آیتیں پڑھی تھیں کہ ہچکی آئی اور خاموش ہوگئے۔ قرآن کی برکت ظاہر ہوئی۔

اللہ تعالی حافظ صاحب کی مغفرت فرمائیں، حفظ قرآن کی بشارتیں ان کے حق میں مکمل فرمائیں۔ ہم باقی رہنے والوں کا خاتمہ ایمان پر فرمائیں۔

اعجاز احمد اعظمی

۴؍ رجب ۱۴۳۴ھ مطابق ۱۵؍ مئی ۲۰۱۳ء بروز چہارشنبہ، ممبئی

❑❑❑

اہلیہ جناب ڈاکٹر کلیم عاجز صاحب پٹنہ

ہمارے قارئین محترم جناب ڈاکٹر کلیم عاجز صاحب سے بخوبی متعارف ہیں۔ وہ ایک دلِ درمند رکھنے والے نہایت دین دار اور صاحبِ محبت انسان ہیں۔ ان کی شاعری محبت و انسانیت کا ایک دل آویز مرقع بھی ہے اور ایک موثر پیغام بھی۔

۲۰/ جولائی بروز دوشنبہ کو ان کی اہلیہ مکرمہ نے ان کی رفاقت کی زندگی کا کلمہِ اختتام پڑھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ عرصہ سے شوگر اور ہائی بلڈ پریشر وغیرہ کی تکلیف جھیل رہی تھی۔ ۹/ جمادی الاولی ۱۴۲۳ھ کو زندگی کی شام ہوئی اور موت نے تمام تکلیفوں سے نجات دلا کر انھیں آرام کی نیند سلا دیا۔ ایک نیک اور دین دار راہیِ آخرت کے بارے میں اللہ کی رحیم و کریم ذات سے یہی امید ہے۔

ان کے نامور شوہر نے زندگی میں بہت دکھ جھیلے ہیں، بہت سی چوٹیں کھائی ہیں۔ بڑھاپے میں یہ ایک اور چوٹ لگی۔ وہ چوٹ سے، چوٹ کے صدمے سے گھبراتے نہیں بلکہ اسے گلے سے لگاتے ہیں۔ یہ صدمہ ضعف و علالت کی حالت میں ایک جاں گداز صدمہ ہے، مگر جس کی نگاہ اللہ تعالی کی ذاتِ کریم پر لگی ہوئی ہو، اس کے لیے یہ صدمہ رضائے الٰہی کی جستجو اور اس کے حصول کے لیے ایک نیا عنوان اور نیا فتحِ باب ہے۔

اللہ تعالی جناب کلیم عاجز صاحب کو اور ان کی اولاد و احفاد کو صبر جمیل اور اجر جزیل سے نوازیں اور مرحومہ کو اپنی خوش نودی و رضوان اور جنت کے رَوح و ریحان سے آسودہ فرمائیں اور دنیا کی ہر تکلیف کے عوض میں اجر و ثوابِ بے حساب عطا فرمائیں اور بروزِ قیامت تمام اہل خاندان کو جن میں ماشاء اللہ شہدا بھی ہیں اور صالحین بھی، خوش و خرم یکجائی نصیب فرمائیں۔ آمین

❑❑❑

پیش لفظ

[درد و درماں]

چودہویں صدی ہجری کی پوری مدت اہلِ اسلام کے لیے ایک آزمایشی اور ابتلائی مدت رہی ہے۔ بالخصوص آخری چوتھائی میں تو وہ قیامت خیز بلائیں اور کرب انگیز حوادث رونما ہوئے کہ حساس و دردمند قلوب تڑپ گئے۔ یہ ابتلائیں کسی خاص ملک اور کسی مخصوص خطے میں محدود نہ تھیں بلکہ پورا عالمِ اسلام ہی ان کی لپیٹ میں رہا۔ انگریزوں کے تسلط سے لے کر قبلہِ اول کے سقوط نیز کعبہ مقدس کے ہنگامے اور افغانستان کے مظالمِ بے جا تک ایک مسلسل تاریخ ہے جہاں مسلمانوں کے قلوب جلے اور جگر ٹکڑے ہوئے ہیں۔ آزادی کے بعد سے ہندوستان کے مسلمان بھی حوادث کے دست برد کے مسلسل شکار رہے۔ ۴۷ء کے ہول ناک خونیں ہنگاموں سے شروع ہو کر ۸۰ء کے مرادآباد، علی گڑھ، الہ آباد کے سنگین فسادات تک آگ اور خون کی ایک ایسی دردناک داستان ہے جس کے محض تصور ہی سے جگر ٹکڑے ہوتا ہے۔ ملک کی کون سی سرزمین ہے جسے مسلمان کے بے گناہ خون نے لالہ زار نہیں کیا ہے اور جہاں ان کی عصمت و آبرو کی دھجیاں نہیں بکھری ہیں؟ ان واقعات نے مسلمانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ مایوسی و شکستگی کے بادل چھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اہلِ فکر اور اہلِ احساس اس کے اسباب و علل کی تلاش میں مصروف ہیں۔ کسی کے نزدیک کچھ علت ہے، کوئی کچھ سبب بتا رہا ہے۔ پھر اس کے علاج و تدارک میں بھی رائیں مختلف و متضاد ہیں۔ اور اخبارات نے تو ایسا ہنگامہ اور شور و غل برپا کر رکھا ہے کہ اخبار بیں طبقہ متحیر ہے کہ آخر کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟ یہ صحافی کچھ کہہ رہا ہے اور وہ ایڈیٹر کچھ لکھ رہا ہے۔ اس سارے شور و شر میں مسلم عوام متحیر اور ششدر ہے کہ ہمارے لیے راہِ عمل کیا ہے؟ بددلی اور مایوسی کی کیفیات نے ان پر کچھ بوکھلاہٹ

اور جھنجھلاہٹ بھی طاری کردی ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی راہ چلیں اور اپنے درد کا کیا مداوا کریں؟

قرآن کی آیات اور احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں بلاخوفِ تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ دنیا کے حالات میں جو تغیرات رونما ہوتے ہیں، خواہ حوادث کے کوہِ گراں ٹوٹ رہے ہوں، طوفانِ بلا کی موجیں اٹھ رہی ہوں، سیلاب وطغیانی کی تباہ کاریاں ہوں، زمینی وآسمانی آفات کا نزول ہو، قحط سالی اور امساکِ باراں کی ہولناکیاں مخلوق کو بے تاب کیے ہوں، قتل وغارت گری کے واقعات سکونِ عالَم کو درہم برہم کررہے ہو، فجائی وناگہانی موتیں سامانِ عبرت بن رہی ہوں، جان ومال کی تباہی قلوب پر خوف وہراس مسلط کیے ہو، آتش زدگی اور غرقابی کی رفتار تیز ہورہی ہو یا زلزلے اور بادوباراں کے جھونکے نظامِ عالم کو متاثر کررہے ہوں، یہ اور اس جیسی بے شمار بلائیں بلاشبہ انسانوں کے اعمالِ بد کے نتائج اور غضبِ خداوندی کے مظہر ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

ظَھَرَ الْفَسَادُ فِیْ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْ النَّاسِ لِیُذِیْقَھُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ. (روم:۴۱) خشکی اور تری میں لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے خرابی اور بگاڑ پھوٹ پڑا، تاکہ ان کے کچھ اعمال کا مزہ اللہ تعالی چکھادیں۔ شاید اس طرح وہ باز آجائیں۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں: وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا مَا تَرَکَ عَلٰی ظَھْرِھَا مِنْ دَابَّۃٍ وَلٰـکِنْ یُؤَخِّرُھُمْ اِلٰی اَجَلٍ مُسَمًّی فَاِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِعِبَادِہٖ بَصِیْرًا. (فاطر:۴۵) اگر خدائے تعالی لوگوں کے اعمال پر ان کی گرفت کرنے لگیں تو روئے زمین پر کسی بھی چلنے والے کو نہ چھوڑیں مگر انھیں ایک مدتِ مقررہ تک مہلت دے رکھی ہے۔ جب وہ مدت آجائے گی تو اللہ تعالی اپنے ہر بندے کو نگاہ میں رکھے ہوئے ہیں۔

یہ دونوں آیتیں اس بات کی قطعی دلیل ہیں کہ بحر وبر کا فساد اور روئے زمین کی آفات اور بلائیں نتیجہ ہیں محض افعالِ عباد کی۔ یعنی انسانوں کے اعمال وکردار کی۔ یہ تاثیر ہیں جو مختلف ہولناکیوں اور زلزلہ وطوفان کی صورتیں اختیار کرکے ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ پھر لطف یہ کہ اعمال کی یہ تاثیرات مکمل رونما نہیں ہوتیں بلکہ جو کچھ ہمارے سامنے آتا ہے اور جن مصایب وحوادث کے ہم شکار ہوتے رہتے ہیں، وہ ان تاثیرات کا محض قدرِ قلیل حصہ ہے۔ ورنہ اگر انسانوں کے

اعمالِ بد کے تمام مضمرات اور مخفی اثرات ظاہر ہونے پر آ جائیں تو زمین کی یہ پشت کسی بھی جاندار کا بوجھ اٹھانے سے قطعی انکار کردے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں: وَمَا اَصَابَکُمْ مِنْ مُصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْ عَنْ کَثِیْرٍ. (شوری ۳۰) جو کچھ مصیبت تم پر آتی ہے وہ تمھارے ہی اعمال کا ثمرہ ہے اور بہت سے افعال تو اللہ تعالی درگزر فرما دیتے ہیں۔

اعمال کے جزا و سزا کی یہ صورت اس درجہ بدیہی ہے اور واضح ہے کہ جس شخص کے دل میں ایمان کا چراغ روشن ہو، خواہ اس کی روشنی کیسی ہی ضعیف اور مضمحل ہو، اس کو جانتا پہچانتا ہے۔ مگر آج کل حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کرلیا ہے...... اور غالباً بلکہ یقیناً یہ حد سے بڑھی ہوئی دنیا داری، اسباب پرستی اور کفر و شرک کی بالا دستی کے منحوس اثرات ہیں...... کہ جب اور جہاں کوئی ارضی و سماوی بلا ٹوٹتی ہے تو عام نگاہیں اپنے اعمال و کردار کا احتساب کرنے اور مسببِ حقیقی اور خدا تعالی کی جانب لو لگانے کے بجائے اس کے اسباب و علل کا سرچشمہ کہیں اور تلاش کرنے لگ جاتی ہیں۔ کبھی زلزلہ اور طوفان آیا یا آندھی اور سیلاب نے تباہ کاری مچائی تو پورا محکمہ موسمیات اس کی تحقیقات میں مصروف ہوجاتا ہے۔ وہ دماغ کا زور لگا لگا کر اس کے اسباب اور پھر اس کے تدارک کی تدبیریں بتا کر ملک و قوم پر احسانِ عظیم کرتا ہے۔ کبھی قتل و خون اور غارت گری کی واردات پیش آئی اور ایک انسان دوسرے انسان کے لیے درندہ بنا، فرقہ پرستی کے شعلہ بار عفریت نے خوں ریزی اور عصمت دری کی آگ برسائی تو اس کی علت اور وجہ آپس کے سیاسی جھگڑوں میں ڈھونڈھی جانے لگی، اور ہر پارٹی اپنی مخالف پارٹی کو تمام واقعات کا ذمہ دار ٹھہرا کر مطمئن ہوگئی، گویا سب مسئلہ حل ہوگیا۔

یہ تلاش و جستجو درحقیقت اپنے اصل مرکز سے بہت دور ہٹ کر ہوتی ہے۔ یہ نگاہیں سراب کے پیچھے دوڑتی ہیں اور اصل مقصد کا سراغ کسی کو نہیں ملتا۔ ڈال پات کو سینچنے والے جڑوں کو فراموش کرکے باغ و بہار کی جستجو میں حیران ہیں، لیکن چمن ہے کہ خشک ہوتا جارہا ہے اور یہ سر پیٹ رہے ہیں کہ ہائے! ہماری تمام تر کاوش ناکام ہوتی جارہی ہے۔ انسان اپنے علم کی نارسائی کا ایسا دردناک منظر دیکھ رہا ہے، لیکن اس پر بھی وہ صحیح راہ چھوڑ کر غلط اور تنگ و تاریک وادیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ ان مصایب کے اسباب وعلل اور اس کے علاج اور مداوا کی اگر تلاش ہے تو انھیں اپنی ذات اور اعمال وکردار سے باہر تلاش کرنا بے سود ہے۔ تعجب تو اہل اسلام پر ہے کہ ان میں بھی ایک بڑی تعداد اپنی تلاش وجستجو کی مہم میں ٹھیک انھیں تیرہ وتار راہوں پر جا نکلی ہے جن پر کفر وشرک میں مبتلا قومیں سر مارا کرتی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں تو اللہ نے روشن اور محکم کتاب دے رکھی ہے جس میں ہر بیماری کی حقیقی علت اور ہر درد کا درماں پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید پڑھو! تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ مصایب ونوایب کا اصل سرچشمہ کیا ہے؟ وہ ہے حق تعالی کی نافرمانی اور عصیان اور پھر اس کے نتیجہ میں اس کی نگاہِ قہر آلود۔

قرآن مجید پڑھو اور دیکھو کہ ابلیس کو سماوات کی بلندی سے خاکِ مذلت کی پستی پر کس چیز نے دے پٹکا؟ اس کی گردن میں لعنتِ ابدی کا طوق کیوں کر ڈالا گیا؟ اور وہ قرب ووصال کے آشیانے سے نکال کر بعد وفراق کے جلتے ہوئے بیابانوں میں کیوں بھٹکایا گیا؟ تمھیں اس میں قومِ نوح کے طوفانِ عظیم کی بھی خبر ملے گی، یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ قوم کی جڑیں ہوائے تند وباد صرصر نے کیوں اکھاڑ پھینکیں؟ اور قومِ ثمود کے کلیجے ایک ہی چیخ میں کیوں کر پھٹ کر رہ گئے؟ تمھیں اسی کتاب میں سدوم کے باشندہ قومِ لوط کی دردناک داستان بھی ملے گی جس کو زمین سمیت آسمان کے قریب لے جا کر الٹ دیا گیا اور زبردست پتھروں کی بے پناہ بارش میں ان کا وجود چکنا چور کر دیا گیا۔ تم قومِ شعیب کی حکایت بھی سنو گے جس پر آگ کا عذاب بشکل سایبان آیا تھا۔ پھر فرعون کا حال بھی اس میں ملے گا کہ وہ اپنے لشکر سمیت کیوں کر پانی کی راہ سے جہنم کی آگ میں جھونکا گیا؟ وہیں تمھیں قارون بھی اپنے اموال وخزائن سمیت زمین میں دھنسا ہوا نظر آ جائے گا۔ تمھیں بنی اسرائیل کے ان ہولناک مصایب کی اطلاع بھی اسی قرآن میں ملے گی جب وہ بار بار ہلاکت کے شکنجوں میں کسے جاتے رہے۔ ان سب واقعات کا اصل راز اور ان کی حقیقت کا اصل سراغ بھی قرآن نے بتا دیا ہے۔ وہاں نہ سائنسی اسباب کا بیان ہے نہ فلسفی اور نہ کچھ اور، بلکہ: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ. (العنکبوت۴۰)
اللہ نے ان پر کچھ ظلم نہیں کیا بلکہ وہی اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔

یہ سارے واقعات مصایب ونوایب کے اصل سرچشمہ کا پتے دیتے ہیں۔ قرآن مجید

میں یہ واقعات محض تاریخی داستان کے طور پر نہیں بیان کیے گئے ہیں، بلکہ ایک انتباہ ہے کہ جو قوم و ملت بھی اُن افعالِ بد کی مرتکب ہوگی جن میں گزشتہ اقوام مبتلا تھیں تو پاداشِ عمل کا وہی دستور یہاں بھی دہرایا جائے گا۔ قرآن کا اصل روے خطاب مسلمانوں ہی کی طرف ہے، انھیں خاص طور سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ نافرمانی و معصیت اور کوتاہیِ کردار و عمل کی آگ کہاں کہاں لگ رہی ہے؟ جس کے لپیٹ میں آکر ہماری جان و مال عزت و آبرو جل رہی ہے۔ اور پوری دنیا میں ایسے خونخوار بھیڑیے مسلط ہوگئے ہیں جن کی پیاس بجز مسلمانوں کے خون کے اور کسی چیز سے بجھتی ہی نہیں۔ اصل غور کرنے کی چیز یہی ہے۔

حضرت مالک بن دینار فرماتے ہیں کہ میں نے کتبِ حکمت (یعنی گزشتہ آسمانی کتابوں) میں پڑھا ہے کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ ’میں اللہ ہوں، بادشاہوں کا مالک ہوں، ان کے دل میرے ہاتھ میں۔ پس جو شخص میری اطاعت کرتا ہے، اس پر ان بادشاہوں کو مہربان کر دیتا ہوں۔ اور جو میری نافرمانی کرتا ہے تو میں انھیں بادشاہوں کو اس پر سزا اور عقوبت کے لیے مسلط کر دیتا ہوں۔ اس لیے تم بادشاہوں کو برا کہنے میں مشغول نہ ہو، میری طرف رجوع ہو، میں ان کو تم پر نرم کر دوں گا۔‘ امام احمد نے وہب سے نقل کیا ہے کہ ’اللہ تعالی نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ ’جب میری اطاعت کی جاتی ہے تو میں راضی رہتا ہوں، برکتیں دیتا ہوں۔ اور میری برکت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اور جب میری اطاعت نہیں ہوتی تو غضب ناک ہوتا ہوں، لعنت کرتا ہوں۔ اور میری لعنت کا اثر سات پشت تک رہتا ہے۔‘ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’جب اللہ تعالی بندوں سے (ان کی بداعمالیوں اور ناسزا حرکتوں کا) انتقام لینا چاہتے ہیں تو بچے بکثرت مرتے ہیں اور عورتیں بانجھ ہو جاتی ہیں۔‘ ایک شخص نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے زلزلہ آنے کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ’زنا لوگ بے باکی سے امرِ مباح کی طرح کرنے لگتے ہیں، شراب پیتے ہیں، موسیقی اور گانے بجانے کا رواج ہو جاتا ہے تو اللہ تعالی کو آسمان پر غیرت آتی ہے اور زمین کو حکم فرماتے ہیں کہ ان کو ہلا ڈال۔‘ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ’ہم دس آدمی جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے۔ آپ ہماری طرف متوجہ ہو کر ارشاد فرمانے لگے کہ ’پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالی تمھیں ان

سے اپنی پناہ میں رکھے۔ جب کوئی قوم بے حیائی کے افعال میں علی الاعلان مبتلا ہوگی تو اس میں طاعون جیسی خطرناک وبا پھوٹ پڑے گی۔ اور اس کے علاوہ ایسی ایسی بیماریوں میں گرفتار ہوں گے کہ ان کے اگلوں نے سنا بھی نہ ہوگا۔ اور جو کوئی قوم ناپ تول میں کمی کا دستور بنالے گی تو وہ قحط و تنگی اور ظلم کے کاموں میں مبتلا ہوگی۔ اور اگر کہیں زکوۃ ترک کی جانے لگے گی تو وہاں بارانِ رحمت کا نزول بند ہوجائے گا۔ اگر چوپاے نہ ہوں تو آسمان سے ایک قطرہ پانی کا نہ گرے۔ اور عہد شکنی میں مبتلا ہونے والی قوم پر دوسری قوموں کے دشمن مسلط کردیے جائیں گے جو زبردستی ان کے مال و دولت کو چھین کر اپنے تصرف میں لائیں گے۔‘

ان جواہر پاروں پر غور کرکے ہمیں اپنی حالت کی تشخیص کرنی چاہیے۔ اب کیا بات ہے جو باقی رہ گئی؟ لوٹ، مار، قتل و غارت گری، حادثات کی کثرت، ناگہانی اموات کی بہتات، اشیاے ضروریہ کی گرانی و کم یابی، نقلی چیزوں اور ملاوٹ کی فراوانی، اسبابِ زندگی کی تنگی، جان و مال پر ہمہ وقتی خطرات اور ان کے علاوہ غیر معمولی حالات کی یورش و یلغار! یہ سب کس کا نتیجہ ہیں؟ یقیناً ہماری کوتاہیاں اور بداعمالیاں ہیں جو غیر معمولی صورتیں اختیار کر رہی ہیں۔

جن حضرات کے قلوب مسلمانوں کے درد و غم سے لبریز ہیں، بالخصوص علما و مشائخ، وہ اس صورت حال سے پریشان ہیں۔ وعظ و نصیحت سے، تقریر و تحریر سے، دعا و مناجات سے جیسے بن پڑتا ہے مسلمانوں کو سنبھالنے، جگانے اور صحیح راہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ مسلمانوں پر مصایب و آلام کے جو آتش فشاں پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں، اس کے لاوے باہر سے نہیں خود انھیں میں سے پھوٹ رہے ہیں۔ اس لیے انھیں خود اپنے ہی میں تبدیلی کرنی چاہیے۔ احوال ان کے اعمال کے تابع ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:

> ”موجودہ غیر معمولی حالات اور حوادث جن کو ”اتفاقی“ کے بے معنی لفظ سے یاد کر کے ان کی اہمیت کو ضایع نہیں کیا جاسکتا، صاف بتلا رہے ہیں کہ اللہ تعالی مسلمانوں کے اس موجودہ جاہلی طرزِ زندگی سے جس میں دعوت کی روح، دین کے لیے جد و جہد و ایثارِ آخرت کی فکر اور ایمانی زندگی کی کیفیات نہ ہوں تو ہرگز راضی نہیں۔ یہ بھی اس کی خاص رحمت اور

> اس امت کے ساتھ خصوصیت ہے کہ وہ ان کو اس طرزِ زندگی پر زیادہ دن تک قایم رکھنا نہیں چاہتا۔ کسی ایک ہفتہ کے واقعات یا کسی ایک ہی دن کا اخبار دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ گویا مسلمان ہر جگہ جھنجھوڑے اور جگائے جا رہے ہیں۔ اور مختلف قسم کے اشارات اور خطرے کی علامت ان کی تنبیہ کو عبرت کا سامان کر رہے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ امت کے لیے ایک زندگی سے دوسری زندگی کو منتقل ہونے کا مرحلہ یا دوراہا سامنے آ گیا ہے اور عالم گیر پیمانے پر ان میں تبدیلی یا انقلاب کا سامان ہو رہا ہے اور ان کو اپنا منصب و مقام یاد دلایا جا رہا ہے۔ دنیا میں جا بجا خصوصاً ہمارے ملک میں ان واقعات کا اثر پڑ رہا ہے اور مسلمانوں میں اپنے مقصدِ زندگی اور اصل مشغلۂ زندگی کی طرف بازگشت کے کچھ آثار ضرور ہیں۔'' (تعمیر حیات ۱۰؍ جنوری ۱۹۸۱ء)

اور یہ تو ایک مثال ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت نہ جانے کتنے اہل درد امت مسلمہ کی اس زبوں حالی پر بے چین و مضطرب ہوں گے۔ حضرت اقدس عارف باللہ مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب دامت برکاتہم جانشین و خلیفہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ بھی موجودہ حالات پر بہت بے قرار اور مضطرب رہتے ہیں۔ حضرت کو خیال ہوا کہ مصایب و حوادث کے غیر معمولی حالات کے متعلق حضرت مصلح الامت قدس سرہ کے فرمودات جو متفرق طور پر رسالہ 'معرفت حق' اور 'وصیۃ العرفان' میں جا بجا شایع ہو چکے ہیں، اگر انھیں قرینے اور سلیقے سے مرتب کر کے شایع کر دیا جائے تو بحالات موجودہ امت مسلمہ کی مفید خدمت ہوگی۔

حضرت مصلح الامت کے دردمند اور پر تاثیر کلمات کا سوز و گداز اور ان کی حرارت نیز ان کے انفاس قدسیہ کی دل آویزی و اثر خیزی محتاج بیان نہیں۔ جن خوش نصیب افراد نے آپ کی مجالس میں شرکت کی ہے یا آپ کے ملفوظات مذکورہ رسالوں میں پڑھے ہیں، وہ اس کے شاہد و معترف ہیں۔ کتنی ہی زندگیاں ہیں جن کی حضرت کے ارشادات سے کایا پلٹ گئی۔ حضرت قاری صاحب کے منشا کی تعمیل میں متفرق رسالوں سے یہ مضامین اقتباس کر کے ایک مرتب شکل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے کہ حضرت مصلح الامت نے کس درجہ دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ مسلمانوں کو صبر و ضبط اور حزم و تدبر کا سبق دیا ہے۔ انھیں اللہ کے ساتھ ربط و

تعلق، دعاوانابت، اتباعِ شریعت، خوفِ خداوندی، تقوی واخلاص کی ترغیب دی ہے۔ اور پھر انھیں خداوند تعالی کی نصرت واعانت کی بشارت سنائی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ان فرمودات سے مسلمانوں کے ٹوٹے ہوئے دل عزم وہمت کی نئی توانائی اور ایمان ویقین کی نئی تازگی پائیں گے۔ اور انھیں توبہ وانابت، رجوع الی اللہ اور تقوی و اخلاص کی سچی توفیق ملے گی اور ان کے اکھڑتے ہوئے قدم پھر سے جم جائیں گے۔ **وما ذالک علی اللہ بعزیز**

❑❑❑

پیش لفظ

[شراب: ایک زہر قاتل]

بعثت نبوی سے پہلے نشہ کا رواج گھر گھر تھا۔ ہر مجلس میں شراب و کباب کے دور چلتے تھے۔ شاعری شراب کے چرچوں سے معمور تھی۔ مے نوشی لوازم حیات میں شامل تھی۔ شہر کا متمدن وتہذیب یافتہ معاشرہ ہو یا جنگل اور دیہات کے خانہ بدوش قبایل، ہر جگہ اس کا چلن یکساں تھا۔ لیکن جب اسلام کا سورج طلوع ہوا تو اندھیریاں خود بخود سمٹنے لگیں۔ برائیوں کے خیمے اکھڑ گئے، فواحش ومنکرات کے اڈے سنسان ہو گئے۔ شراب ام الفواحش ہے، ظاہر ہے کہ زندگی کے حدود سے اسے بھی نکلنا تھا۔ اسلام نے اسے بھی کوسِ رحیل سنا دیا۔ پھر کیا تھا آناً فاناً مے خانے ویران ہو گئے، ساغر و مینا ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے، جام وسبو بکھر گئے، لوگوں کی عقلیں ٹھکانے آ گئیں، مستی کا دور ختم ہوا، انسانیت نے نئی زندگی پائی۔ وہی لوگ جنھیں شراب کسی معشوقہ ودل نواز کی طرح پیاری تھی اب انھیں کے نزدیک وہ بول براز سے زیادہ نجس اور قابلِ نفرت بن گئی۔ ایک مسلمان اور شراب کا تصور ممکن نہ رہا۔ غیر مسلم دنیا اب بھی اس نشہ میں چُور رہی لیکن اسلام نے بدمستی اور عقل وہوش کا فرق اچھی طرح واضح کر دیا۔

تاہم احوالِ زمانہ بدلتے رہتے ہیں۔ تاریکیاں کبھی اجالا دیکھ کر چھپ جاتی ہیں اور کبھی موقع پا کر اپنی سیاہ چادر پھیلانے لگتی ہیں۔ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں یہ ایسا وقت ہے جب فواحش ومنکرات کا طغیان آیا ہوا ہے۔ نیکیوں کا چمن مرجھا رہا ہے اور برائیوں کا خارزار جنگل پھیلتا جا رہا ہے۔ ہر معاشرہ، ہر طبقہ اور ہر ملک گلے گلے اس سیلاب میں ڈوبا ہوا ہے۔ ضرورت ہے کہ سفینۂ عالَم کے ناخدا یعنی اہل اسلام اٹھیں اور دنیا کو خطرات سے بچانے کے لیے جان وتن کی بازی

لگا دیں اور علم و عمل، زبان و قلم اور جسم و روح کی تمام طاقتیں فواحش و منکرات کے مٹانے میں صرف کر دیں۔

عرصہ سے خیال تھا کہ ان منکرات پر قرآن و حدیث کی روشنی میں مختصر مختصر رسالے لکھ کر شایع کیے جائیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے خیال ہوا کہ نشہ اور شراب خوری کی مذمت پر کچھ لکھنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ وبا اب غیر مسلموں سے متعدی ہو کر مسلمانوں میں پھیل رہی ہے۔ شاید کسی کو تنبہ ہو۔ میں عدیم الفرصتی اور ناکارگی کے باعث ہمت نہ کر سکا۔ عزیزی مولوی عبدالقادر سلمہ (متعلم دارالافتا ریاض العلوم گورینی) سے کہا کہ اس موضوع پر وہ لکھیں۔ چنانچہ عزیز موصوف نے کافی محنت کر کے اس کام کو پایہِ تکمیل تک پہنچایا۔ مجھ سے جہاں تک ہوسکا اس پر نظر ثانی کر دی، جابجا مشورے دیے، جنھیں عزیز موصوف نے خوش دلی اور سعادت مندی سے قبول کیا۔ یہ ان کی پہلی قلمی کاوش ہے جو ناظرین کے سامنے آرہی ہے۔ اس کوشش کو دیکھ عزیز موصوف سے توقع ہوتی ہے کہ وہ اس راہ میں مزید ترقی کریں گے۔ زبان و بیان میں نکھار پیدا ہوگا، تحریر کا سلیقہ اور بڑھے گا اور زبان و قلم سے زیادہ سے زیادہ خدمتِ دین و ملت کریں گے۔

حق تعالی (سے دعا ہے) کہ ان کا یہ رسالہ حسن قبول پائے اور امت مسلمہ کے لیے نفع بخش ہو اور حق تعالی کی رضا نصیب ہو۔

❑❑❑

مقدمہ

[زمزمہ انقلاب]

دنیا میں قوموں اور جماعتوں نیز آحاد وافراد پر احوال وکوایف کے تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی قوم عروج وترقی کے تخت وتاج سے سرفراز ہوتی ہے اور دوسری ملتیں اس کے سامنے سرنگوں اور گردن فگندہ ہوتی ہیں۔ پھر ناگاہ عالم غیب سے انقلاب وتبدیلی کا ایک ایسا جھونکا چلتا ہے کہ جو قوم کل تک تخت وسلطنت پر تھی آج وہ تختۂ دار پر لٹکی نظر آتی ہے اور جو جماعت کل ذلت وپستی کے دلدل میں الجھی ہوئی تھی آج عزت ورفعت اس کے قدم چوم رہی ہے۔

یہ عروج وزوال کا سلسلہ کیوں ہے؟ کیا ترقی وتنزلی اتفاقی ہے؟ اتفاقاً کوئی قوم اپنی قوتِ بازو سے رفعت وبلندی کے بامِ ثریا تک جا پہنچتی ہے اور پھر اتفاقاً ہی وہ تحت الثری کی گہری دلدلوں میں گرکر بے نام ونشان ہوجاتی ہے؟ جو لوگ وحیِ الٰہی کی روشنی سے محروم ہیں ان کے نزدیک تو یقیناً یہ بخت واتفاق ہی کا کرشمہ ہے۔ جس میں ذاتی صلاحیت، قوتِ کار اور حوصلہ مندی و بلندِ ہمتی یا پستیِ طبع، دونِ ہمتی ظلم وعدوان کا بھی دخل ہے۔ لیکن جن کو وحیِ نبوت کی روشنی ملی ہے وہ اسے محض بخت واتفاق کا نتیجہ نہیں سمجھتے بلکہ اس کے پیچھے خداوند تعالی کے علم وارادہ کی کارفرمائی کا یقین رکھتے ہیں۔ حق تعالی کا ارشاد ہے: قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ. (آل عمران:۲۶) تم کہو اے اللہ! ملک کے مالک! آپ جسے چاہیں ملک عنایت فرمائیں اور جس سے چاہیں ملک چھین لیں۔ جس کو چاہیں عزت دیں اور جس کو چاہیں ذلت وپستی میں ڈال دیں۔ آپ ہی کے ہاتھ میں خیر ہے۔ بلاشبہ آپ ہر چیز پر قادر ہیں۔

عروج وزوال کے اس قاعدہ سے قومِ مسلم بھی مستثنا نہیں۔ عرصہ ہوا کہ چشم فلک نے یہ

منظر دیکھا تھا کہ سرزمینِ ہند مسلم شہ سواروں کے گھوڑوں سے پامال تھی۔ ہر روز مسلمانوں کا ایک نیا قافلہ یہاں کمر کھولتا تھا اور یہاں قدیم باشندے بھی اس قافلہ میں برابر شامل ہوتے رہے۔ پھر زمانہ نے یہ نظارہ بھی کیا کہ حکومت وسیاست اور عزت وغلبہ کی کنجیاں ان کے ہاتھوں سے چھوٹتی چلی جارہی ہیں۔ آج یہ ریاست ختم ہوئی، کل اس حکومت کا تختہ الٹا۔ آج یہ بادشاہ زندانِ فرنگ بنا، کل وہ والیِ ریاست غیروں کے پاؤں پر گرا۔ پھر اب یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلامی اقتدار کا چراغ گل ہوچکا ہے اور ظلمتِ شب کی مخلوق خلقِ خدا کو ستاتی پھر رہی ہے۔ وہی مسلمان جو کل تک مظلوموں وبے کسوں کی پناہ گاہ تھا اب ایک سایۂ دیوار کا محتاج ہوگیا۔ ایک دردناک داستان ہے جسے عزیزم مولوی جمشید سلمہ نے سنانے کا ارادہ کیا ہے۔ یہ داستانِ درد بھی سنائیں گے، اسباب و علل کی کھوج بھی لگائیں گے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی نشان دہی بھی کریں گے۔ شاندار ماضی اور دردناک حال پر تبصرہ وتجزیہ کے بعد مستقبل میں راہِ عمل کیا ہو؟ خدا کی رحمت کیسے متوجہ کی جائے؟ کن اعمال واحوال کے ذریعہ قوم پھر اپنے کھوئے ہوئے منصب کو پاسکتی ہے؟ یہ ساری باتیں مولف عزیز نے ایک اچھے پیرائے میں بیان کی ہیں۔

عزیز موصوف میدان قلم میں تازہ وارد ہوئے ہیں۔ کسی مبتدی اہلِ قلم کے لیے زبان و بیان کی کوتاہیاں ناگزیر ہیں، تاہم یہ ان کی کامیاب کوشش ہے اور اس رسالہ سے ان کی تحریری صلاحیتیں صاف نمایاں ہیں۔ مشقِ قلم جاری رہے اور تحقیقی موضوعات کی طرف اگر یہ متوجہ ہوں تو ان شاءاللہ امت مسلمہ کے لیے کارآمد ثابت ہوں گے۔

دعا ہے کہ حق تعالیٰ عزیز موصوف کو اور ان کے رسالہ کو قبولیت سے نوازیں اور مزید خدمات کی توفیق دیں۔ آمین

اعجاز احمد اعظمی

۲۴/ جمادی الآخر ۱۴۱۰ھ

* * *

خطبات نبوی

از: مولانا حبیب الرحمان ندوی

مجلّہ المآثر کے سلسلے میں جب محدثِ جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی نوراللہ مرقدہ کے آستانہ مبارک پر حاضری ہوئی اور ہر ہفتہ مسلسل آنے جانے کا سلسلہ قایم ہوا تو ایک سنجیدہ ومتین صاحبِ علم سے تعارف ہوا۔ پستہ قد، شرافت وتہذیب چہرہ پر نثار ہوتی ہوئی، آواز کی آہستگی اور نرمی دل کی نرمی اور خوش اخلاقی کا پتا دیتی تھی۔ معلوم ہوا کہ مدرسۃ المساکین بہادر گنج کے ذمہ دار ہیں۔ سادہ مزاج، سادہ لباس، تواضع ومسکنت کے پیکر! یہ تھے مولانا حبیب الرحمان ندوی۔

مولانا اصلاً قصبہ ادری کے رہنے والے تھے۔ بعد میں انھوں نے مئو میں سکونت اختیار کر لی۔ صاحبِ علم تھے، مگر علم کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ معاش کے لیے تجارت کا مشغلہ اختیار کیا اور اس میں کامیاب ہوئے۔

تاجر تھے، ایک مدرسہ کے صدر تھے۔ یہ دونوں امور ایسے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک میں پڑ کر آدمی علم وحکمت سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ تجارت کی ذمہ داریاں اور اس کی مشغولیتیں اتنی شاخ در شاخ ہوتی ہیں کہ اگر کوئی ان کا حق ادا کرنا چاہے تو بجز گنتیوں کے اسے کلمات وحروف سے بہت کم واسطہ رہ جائے گا۔ اور مدرسوں کی صدارت...... صدر مدرسی نہیں...... اور نظامت ایسی الجھن کے عہدے ہیں کہ ان میں پڑ کر علم سے لگاؤ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ مولانا ان دونوں مشغلوں میں مبتلا تھے، اس لیے تصور نہ تھا کہ کسی علمی یا تصنیفی کام کا موقع انھیں ملتا ہوگا۔ یا کسی علمی ذوق کے مالک ہوں گے۔ بعض رسالوں میں ان کے بعض مضامین پڑھے تھے تو خیال تھا کہ شاید کچھ لکھ لیتے ہوں لیکن ان کی وفات کے بعد...... کافی دنوں کے بعد...... ایک روز عزیز محترم مولانا خلیل وارث

صاحب ولید پوری کی معیت میں مولانا مرحوم کے صاحبزادے جناب ماسٹر انیس احمد صاحب تشریف لائے اور والد مکرم کے مضامین کا مجموعہ جو رسول اکرم ﷺ کے خطبات و مواعظ کی تشریح و تبیین میں لکھے گئے تھے، پیش کیا تو ایک خوش گوار حیرت ہوئی۔ ۲۸۹؍صفحات پر مشتمل کتاب ’خطباتِ نبوی‘ ذوقِ تحریر و تصنیف اور جستجوے علم و حکمت کا آئینہ دار ہے۔ میرے خیال و گمان میں ہرگز یہ بات نہ تھی کہ ایک شخص جس کا سابقہ مختلف تاجروں سے، اسامیوں سے، گاہکوں سے پڑتا ہو، جس کے وقت کا بڑا حصہ بہی کھاتوں کی مغز ماری میں صرف ہوتا ہو، جسے دن بھر گنتیوں کے جوڑ گھٹانے اور ضرب و تقسیم میں لگے رہنا پڑتا ہو، وہ کوئی اچھی علمی تحریر بھی لکھ سکتا ہوگا۔ لیکن جب کتاب کے اوراق کو پلٹا تو حساب کتاب، بہی کھاتہ سب پیچھے نظر آیا اور علم و تصنیف کا ذوق آگے ملا۔ گنتیوں کے حساب کتاب کو ان کے وارثوں نے ایک بار دیکھا ہوگا، پھر انھیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اور گنتیوں کی عمر ہی کیا ہے؟ جہاں وہ چیز ختم ہوئی جس کی گنتی لکھی گئی، خواہ مالِ تجارت ہو یا روپے پیسے ہوں، ان کے ختم ہوتے ہی گنتی مردہ ہو جاتی ہے۔ گنتی بھی مردہ، گنتی والا کاغذ بھی مردہ! لیکن وہ کلمات و حروف جنھیں علم کی تابناکی حاصل ہے، لکھنے والا دنیا سے چلا جاتا ہے، عرصہ گزر جاتا ہے مگر ان کی زندگی باقی رہتی ہے۔ پھر لکھنے والا ان کلمات و حروف کی روشنی میں جگمگاتا رہتا ہے۔

مولانا مرحوم کے حالات زندگی مجلّہ ’المفتاح‘ میں ان کے صاحبزادے محترم جناب ماسٹر انیس احمد صاحب نے لکھے ہیں۔ اسے اور زیرِ نظر کتاب خطبات نبوی پر مولانا اسیر صاحب ادروی کے لکھے ہوئے پیش لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم اپنی تمام تر تجارتی مشغولیات کے باوجود لکھنے پڑھنے کا وقت نکال لیا کرتے تھے اور ان کے مضامین مختلف رسالوں میں مسلسل شایع ہوا کرتے تھے۔ اسی دوران انھوں نے سلسلۂ مضامین کے لیے ایک اچھوتا موضوع چنا۔ یعنی نبی کریم ﷺ کے خطبات جو حدیث کی بے شمار کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ خطبات مسلسل اور پورے بہت کم ملتے ہیں۔ راویوں کے انتخاب و ترتیب کے مطابق اور موضوع کی مناسبت سے متفرق طور پر کہیں دو چار جملے کہیں اور زیادہ اور کہیں اور کم پائے جاتے ہیں۔ لیکن آپ کو اللہ تعالی نے جوامع الکلم سے نوازا تھا، اس لیے آپ کی زبانِ مبارک سے نکلا ہوا ہر جملہ اپنے اندر جہانِ

معنی رکھتا ہے۔ مولانا مرحوم نے خطبات نبوی کے ان جملوں اور فقروں کو حدیث کی مختلف کتابوں سے اٹھایا، ان کی تشریح وتوضیح کی، عنوانات قایم کیے اور مضامین کا ایک سلسلہ مرتب کیا۔ مولانا کا اندازِ نگارش سادہ اور بے تکلف ہے۔ آمد ہی آمد ہے، اس میں کہیں آورد اور تکلف کا شبہ نہیں ہوتا، لیکن خشک اور بے مزہ نہیں ہے۔ اس میں ادب کی ہلکی پھلکی چاشنی مسلسل ملتی رہتی ہے۔ نرم روندی کی طرح ان کا قلم چلتا ہے، جتنا جتنا آگے بڑھتے جایئے کیف وسرور بڑھتا رہتا ہے۔ جیسے ہلکی ہلکی بارش ہو اور زمین اسے جذب کرتی جائے اور اس کا سینہ ٹھنڈا ہوتا جائے۔ یہی حال مولانا مرحوم کی تحریروں کا ہے۔ ان کی تحریریں چونکانے والی یا یک حیرت میں ڈال دینے والی نہیں ہوتیں، لیکن پڑھتے جایئے اور سینہ ودل میں ایمان کی خنکی اور اطمینان کی برودت جذب ہوتی چلی جائے۔

خطباتِ نبوی کا یہ مجموعہ ۳۸؍خطبات پر مشتمل ہے، جن میں بعض خطبے طویل ہیں اور اکثر مختصر ہیں مگر جامعیت ونافعیت ان کا طرہ امتیاز ہے۔ مولانا نے اپنے مضامین میں ان خطبات کا پسِ منظر بھی بتادیا، ان کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں، ان کے ترجمے بھی عام فہم انداز میں کیے ہیں۔ اور ان سے جو نتائج وبصائر حاصل ہوتے ہیں انھیں بھی ذکر کیا۔ متعدد جگہوں پر گمراہ نظریات پر اشاروں میں تنقیدیں بھی کی ہیں۔

کچھ نمونے اور اقتباس یہاں نقل کیے جاتے ہیں، ان سے مصنف کے اندازِ تحریر کا بھی اندازہ ہوگا، خود ان کے ذوق ومزاج کی بھی جھلک ملے گی، نبی کریم ﷺ کے خطبوں کی اثر آفرینی کا بھی تجربہ ہوگا۔

خطبہ کوہِ صفا:

نبی کریم ﷺ نے نبوت ورسالت سے سرفراز ہونے کے بعد اپنی قوم کے سامنے پہلا خطبہ جو ارشاد فرمایا ہے، حدیث وتاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوہِ صفا کی بلندی سے ارشاد فرمایا ہے۔ اس خطبہ کا پس منظر بتاتے ہو لکھتے ہیں:

> ”یہ نبوت کا تیسرا سال ہے، گنتی کے چند افراد مسلمان ہوئے ہیں۔ مکہ کے تنگ دل متعصب اور تشدد پسند لوگوں کے خوف سے تبلیغ واشاعتِ دین کے فرایض نہایت رازداری سے انجام دیے جارہے ہیں، مگر انھیں حالات میں حکم آتا ہے ’**فاصدع بما تومر**‘ (**حجر**)

پیغام ربانی کا برملا اظہار کیجیے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر 'وانذر عشیرتک الاقربین' (شعرا) اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈرائیے۔

ظاہر ہے کہ اس حکم کے بعد اب راز داری کی گنجایش نہیں۔ چنانچہ آں حضرت ﷺ لوگوں کو ڈرانے اور برملا تبلیغ و اشاعت کے لیے کوہ صفا کی بلندیوں پر تشریف لے جاتے ہیں اور پکارتے ہیں 'یا صباحاہ!' قریش چونک پڑتے ہیں اور دوڑے ہوئے آتے ہیں۔ کیوں کہ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی دشمن قبیلہ کی غارت گری کے لیے آتا ہے۔ عجیب و غریب منظر ہے۔ لوگ سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔ آں حضرت ﷺ کوہِ صفا کی بلندیوں سے لوگوں کو خطاب فرما رہے ہیں۔ (ص:۱۴)

یہ خطبہ کیا تھا؟ خواجہ حالی کی زبان سے سنیے!

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
زمیں جس نے ساری عرب کی ہلا دی

واقعی یہ خطبہ بجلی کی وہ پہلی لپک تھی جس نے گھنگھور گھٹاؤں کے درمیان یکایک اجالا کر دیا۔ سننے والے چونک پڑے، یہ اجنبی آواز اپنے مدتوں کے ایک مانوس و معروف شخص کی زبان سے کیوں کر نکل رہی ہے؟ آپ فرماتے ہیں:

"اریتم لو اخبرتکم ان خیلاً یخرج بسفح هذا الجبل اکنتم مصدقی."

(مسلم شریف: ج۱ص۱۱۴) اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکلنا چاہتی ہے تو کیا تم میری اس بات کو مان لو گے؟" (ص:۱۵)

حضرت ﷺ کے سوال کا مقصد اور اس کی بلاغت کی شرح کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

"ظاہر ہے کہ جب دور سے کوئی لشکر آتا ہے اور کسی گاؤں یا شہر کے قریب پڑاؤ ڈالتا ہے تو گھوڑوں اور جانوروں کی آواز، ہتھیاروں کی جھنکار اور لوگوں کا شور و غل دور تک سنائی دیتا ہے۔ خصوصاً ریگستانی علاقے میں تو جب کوئی ایک سوار بھی دور سے آتا ہے تو گھوڑے کی اڑائی ہوئی گرد میلوں سے اس کی آمد کا پتہ دیتی ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ لشکر کی آمد کا کوئی ظاہری قرینہ موجود نہ ہو، اس سوال کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ میری زندگی اور

> میرے کردار سے تم بخوبی واقف ہو۔ بتاؤ! اگر میں قراین اور بدیہیات کے خلاف بھی کوئی بات کہوں تو کیا میری تصدیق کروگے؟“

اس سوال کا جواب آپ کی گھبرائی ہوئی قوم نے کیا دیا، وہ حق وصداقت کی طاقت و سطوت کا ایک بہترین مظہر ہے۔ یہ ان لوگوں کی ایک معتبر شہادت ہے جن کے سامنے آپ ﷺ زندگی کی پانچویں دہائی میں پہنچ چکے تھے۔ گو ان میں سے بہت سے لوگ اپنی اس متفقہ شہادت سے مکرنے کی کوشش کرنے لگ گئے لیکن تاریخ نے ان کی اس شہادت کو ریکارڈ کرلیا اور آج بھی وہ ریکارڈ موجود ہے۔ مولانا مرحوم لکھتے ہیں:

> ”چوں کہ حاضرین میں سب لوگ آپ سے اچھی طرح واقف ہیں اور سب کو آپ پر اعتماد ہے، اس لیے سب ایک زبان ہو کر کہتے ہیں: ”ماجربنا علیک کذباً“ ، ہم ضرور یقین کریں گے، کیوں کہ آپ کی پوری زندگی ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے آپ کا بچپن، آپ کی جوانی اور موجودہ زندگی اچھی طرح دیکھی ہے۔ کبھی کسی بات پر آپ نے دروغ بیانی سے کام نہیں لیا۔ اس لیے آج ہم کیسے آپ پر غلط بیانی کا احتمال کر سکتے ہیں؟ ارشاد ہوتا ہے: میری صداقت کا تمھیں یقین ہے تو سنو!
>
> ”فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید.“ میں ایک آنے والے سخت عذاب سے ڈرا رہا ہوں۔
>
> افسوس! ابولہب نے خطبہ پورا نہیں ہونے دیا اور یہ کہہ کر لوگوں کو منتشر کردیا کہ: ” تباً لک الھذا جمعتنا؟“ تُف ہے! کیا اسی لیے آج ہم کو جمع کیا تھا۔ (ص:۱۵)

مساجد کی عظمت:

مصنف نے رسول اللہ ﷺ کا ایک خطبہ نقل کیا ہے جس میں آپ نے مسجدوں کے آداب وحقوق بیان کیے ہیں۔ اس کی تمہید میں وہ مسلمانوں کے عام معاشرہ کے حالِ زبوں پر ماتم کرتے ہوئے کتنا صحیح لکھتے ہیں:

> ”مسجدیں تعمیری لحاظ سے تو ضرور خوب صورت اور شاندار بننے لگیں مگر ان کے لیے جو اصل حکم تھا ان کے آداب وحقوق کا، ان کی طرف سے غفلت برتی جانے لگی اور اب تو نوبت

> یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کسی سے کہو کہ مسجدوں کے کچھ آداب وحقوق ہیں تو وہ حیرت سے کہنے والے کا منھ تکنے لگتا ہے۔ ابھی بیس پچیس سال پہلے کی بات ہے، مسلمان بے ہوشی اور نشے کی حالت میں مسجد کی طرف سے گزرنے کا تصور نہیں کرتے تھے مگر آج انھیں کی اولاد ’مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے‘ کا ورد کرتی ہے۔ اور اس کے سامنے جب مسجدوں کے بالکل متصل منکرات وفواحش کا اڈہ (سینما ہال) تعمیر کیا جاتا ہے تو وہ اس پر خوش ہوتی ہے اور مسجد کو ویران چھوڑ کر منکرات وسیئات کے اڈوں کی طرف اس طرح دوڑتی ہے جیسے پروانے روشنی کو دیکھ کر بے خودی کے عالم میں جھومتے اور گنگناتے اس پر فدا ہونے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔
>
> قلم کا نوک چاہے تھرتھرا رہا ہو مگر یہ حقیقت تو بہر حال اپنی جگہ سو فی صد درست ہے کہ مسلمان کہلانے والوں میں سے ایسے بھی ہیں جو مسجدوں میں جاتے ضرور ہیں مگر کس لیے؟ نماز پڑھنے کے لیے نہیں، صرف نہانے، منھ دھونے اور استنجا کرنے کے لیے! ان کو اگر آرام کرنے یا سفر میں کہیں ٹھہرنے کی ضرورت پیش آگئی تو مسجد کی تلاش ضرور کریں گے مگر زندگی میں شاید ہی باید کبھی یہ نوبت آئی ہو کہ انھوں نے نماز کے لیے مسجد کا رخ کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی بدبختی کے لیے اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ اللهم احفظنا منه.“ (ص:۷۰)

کثرتِ سوال سے ممانعت:

اس عنوان کے تحت مولانا مرحوم نے جو کچھ لکھا ہے وہ موجودہ زمانہ کی ایک اہم ضرورت ہے۔ مولانا نے اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کے متعدد خطبات نقل کرکے ان کی بلیغ تشریح کی ہے اور ساتھ ہی زمانہ حال کے مسائل پر ان کا انطباق بھی کیا ہے۔ اقتباس ذرا طویل ہوگا لیکن بہت ضروری اور بہت مفید ہے۔ مغز ہی مغز ہے۔ قارئین اسے پڑھیں اور شریعت کی روح اور مزاج کو سمجھیں۔ مولانا نے اس کی تمہید اس طرح لکھی ہے:

> ”سیدھے سادے طریقہ پر کسی حکم کے ماننے کے بجائے اس میں کرید اور کثرتِ سوال ایک معیوب بات ہے، خصوصاً دینی امور میں۔ جب بقدرِ ضرورت کسی حکم کی تفصیل بیان کی جائے تو اس میں غیر ضروری سوال کسی طرح مناسب نہیں۔ آں حضرت ﷺ نے تاکید اس

> کی ممانعت فرمائی ہے اور صاف بتا دیا ہے کہ اس وقت جب احکامات بیان کیے جا رہے ہیں تو ردوکد سے پابندیوں میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے اور کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جو حکم دیا جائے حسبِ استطاعت اس پر عمل کرو۔ کرید اور کثرتِ سوال سے خواہ مخواہ اپنے اوپر پابندی بڑھانے کی کوشش نہ کرو۔‘‘ (ص:۷۴)

اس تمہید کے بعد مولانا نے رسول اللہ ﷺ کے اس موضوع پر متعدد خطبات نقل کر کے ان کی تشریحات کی ہیں۔ یہاں ہم ایک خطبہ اور اس کے متعلق مولانا نے جو کچھ لکھا ہے، اسے نقل کرتے ہیں۔ موضوع آج کی ضرورت کا ہے۔ اس سے مولانا کا اسلوبِ تحریر، زورِ بیان، عمقِ نگاہ اور مومنانہ بصیرت سب کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی اقتباس پر یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ’’مستدرک حاکم اور دارقطنی کے حوالے سے حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس موقع پر آں حضرت ﷺ کے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں: **ماحل اللہ فی کتابہ فھو حلال و ماحرم فھو حرام وما سکت عنہ فھو عفو. وسکت عن اشیاء رحمۃ لکم غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا، فاقبلوا من اللہ عافیتہ. فان اللہ لم یکن ینسی شیئاً. ثم تلا ھذہ الآیۃ: ’یا ایھا الناس لا تسئلوا عن اشیاء ان تبدلکم تسوکم.‘** [۱] (فتح الباری، کتاب الاعتصام) اللہ نے جو کچھ اپنی کتاب میں حلال کیا ہے وہ حلال ہے اور جو کچھ حرام قرار دیا ہے وہ حرام ہے اور جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا ہے تو اس میں بھول اور نسیان کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ تو رحمت کی وجہ سے کیا گیا۔ اس لیے بلا وجہ ایسی باتوں کو موضوعِ بحث نہ بناؤ۔ خدا سے عافیت طلب کرو [۲] خدا کسی بات کو بھولتا نہیں۔ اس نے خود فرمایا! مسلمانو! ایسی بات نہ پوچھو جس کے ظاہر ہونے سے تمھیں تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو۔‘‘

سبحان اللہ! کیسی سیدھی، آسان اور مختصر بات ہے کہ اللہ نے جو کچھ اپنی کتاب میں حلال کیا ہے وہ حلال ہے اور جو کچھ حرام کیا ہے وہ حرام ہے اور جن چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا وہ مباح اور معاف ہیں۔ نعوذ باللہ اس میں بھول چوک اور نسیان کو کچھ دخل نہیں بلکہ یہ تو صرف رحمت

کی وجہ سے کیا گیا کہ انسان زیادہ سے زیادہ قانونی بندشوں سے آزاد رہے اور دین کی اصولی اور بنیادی تعلیمات کی روشنی میں اپنی ضروریات کے مطابق آزادی سے ہر وہ کام کر سکے جو اس کے لیے مباح ہے۔

رحمت و شفقت کا اظہار اس سے زیادہ اور کیا چاہیے کہ خود سرکار دو عالم ﷺ کرید اور کثرتِ سوال سے منع فرما رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ پابندیاں اور بندشیں سوال ہی کی بدولت عاید ہوتی ہیں، اس لیے ان سے احتراز کرو۔

صرف کثرتِ سوال کی ممانعت ہی نہیں، ایک خطبے سے...... جو پہلے نقل کیا گیا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ: **فانما هلک من کان قبلکم بکثرة سوالهم و اختلافهم علی انبیائهم**...... یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اختلاف اور کثرتِ سوال میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کرید، نکتہ چینی اور کج بحثی کا لازمی نتیجہ اختلاف ہے۔ دور کیوں جایئے، فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین اور رکعتِ تراویح جیسے مسائل میں غلو اور شدتِ اختلاف، کیا کسی کرید، نکتہ چینی اور کٹ حجتی کا نتیجہ نہیں؟ صدیوں سے یہ مسائل موضوعِ بحث بنے ہوئے ہیں، مگر کیا کج بحثی سے اختلاف میں کوئی کمی ہوئی؟ زیادہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس قسم کی باتوں پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے لوگ ان فروعی اور اختلافی مسائل کو اصل اسلام سمجھنے لگے۔...... تھوڑے دنوں پہلے مجھے ایک مدرسہ میں جانے کا اتفاق ہو۔ وہاں میں نے دیکھا کہ مفتی صاحب کے پاس سوالات کی بھرمار ہے۔ ایک صاحب نے پوچھا تھا کہ ''ایامِ تشریق میں نابالغ بچوں کا ناخن ترشوانا کیسا ہے؟'' اور ایک صاحب نے پوچھا تھا کہ ''امریکن ڈیزائن کا بیت الخلا بنوانا جائز ہے یا ناجائز؟'' کچھ اور سوالات تھے جن میں پوچھا گیا تھا کہ ''تمباکو کو کس طرح کھانا چاہیے؟ چائے کس طرح پینی چاہیے؟'' میں یہ نہیں کہتا کہ اس قسم کے سوالات کرنا جائز نہیں لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ یہ ذہنیت ملتِ اسلامیہ کے لیے تباہ کن ہے کہ بنیادی اور اصولی باتوں کی طرف تو کوئی توجہ نہ دی جائے، لیکن فروعی اور اختلافی مسائل پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے اور اس کو اتنا پھیلایا جائے کہ ایک شخص اگر ان کی تفصیل معلوم کرنا چاہے تو اس کی موجودہ زندگی اس کے لیے ناکافی ہو۔ (ص: ۷۷/۷۸/۷۹)

❑❑❑

۱) مستدرک حاکم اور دارقطنی دونوں کی روایت کے الفاظ کو مولانا نے مخلوط کر کے نقل کیا ہے۔ حاکم کے الفاظ یہ ہیں: ماحل الله فی كتابه فهو حلال وما حرم فهو حرام وما سكت عنه فهو عفو. فاقبلوا من الله عافيته. فان الله لم يكن يسنى شيئاً. ثم تلا هذه الآية: وما كان ربک نسياً.

اوردارقطنی کے الفاظ یہ ہیں: ان الله فرض فرائض، فلا تضيعوها. وحد حدوداً، فلا تعتدوها. وسكت عن اشياء رحمة لكم غير نسيان. فلا تبحثوا عنها.

۲) ’فاقبلوا عافيته‘ کا ترجمہ یہ صحیح ہے کہ ’اللہ کی دی ہوئی عافیت کو قبول کرو۔‘ ’خدا سے عافیت طلب کرو۔‘ ’فاطلبوا العافية‘ کا ترجمہ ہے۔ غالبًا یہ کاتب کا تصرف ہوگا۔

* * *

تقریظ

[نزالمجدد]

حق تعالی کا ارشاد ہے: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ. (المائدہ:۳) آج میں نے تمھارا دین تمھارے لیے مکمل کر دیا اور اپنا احسان تم پر تام کر دیا۔

اب اس کامل اور مکمل دین میں کسی اضافے اور کسی کمی کی گنجایش نہیں ہے۔ اللہ تعالی نے ایک حصار قایم فرما دیا، اب نہ اس سے کوئی چیز خارج ہو سکتی ہے یعنی دین کی کوئی بات بعد میں دین نہ رہے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس میں کوئی چیز باہر سے داخل کی جا سکتی ہے یعنی جو بات دین نہیں ہے اسے دین بنا کر اس میں اضافہ کر دیا جائے، اس کی گنجایش نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”من احدث فی امرنا ھذامالیس فیه فھورد.“ (ابو داؤد: رقم الحدیث ۴۶۰۶) ہر وہ بات جس پر ہمارا امر نہیں ہے وہ رد ہے۔ اور فرمایا کہ: ”کل محدثة بدعة، و کل بدعة ضلالة.“ (ابو داؤد: رقم الحدیث ۴۶۰۷) دین میں ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

دین کی ہر ایک بات مدون اور مکمل ہے۔ اس کے لیے خاص دلایل ہیں۔ ان دلایل کے درجات ہیں۔ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔ یہ چار دلایل ہیں جن سے کسی بھی دینی حکم کا ثبوت یا ظہور ہوتا ہے۔ اور جو بات ان میں سے کسی دلیل سے ثابت اور ظاہر نہ ہو، وہ بدعت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات نے دین کے حصار کو مضبوط کر دیا ہے۔ دین اور غیر دین کو بالکل واضح اور ممتاز کر دیا ہے۔ دینی امور سب کے سب معروف اور معلوم ہیں۔ اضافہ کرنے والوں نے کہیں کچھ اضافہ کیا اور کہیں کچھ اضافہ کیا۔ ایک جگہ کی بدعت دوسری جگہ نامعلوم ہے اور ایک دور کی بدعت دوسرے دور میں اجنبی ہے۔ اور سنت نہ کہیں اجنبی ہے اور نہ کسی دور میں نامعلوم رہی ہے۔

بدعات بدلتی رہتی ہیں، سنتیں لازوال ہیں۔ ہندوستان کا مسلمان مصر کی بدعتوں سے نا آشنا ہے اور ہندوستان کی بدعتیں مصر میں نامانوس ہیں۔ بدعات ہنگامی ہوتی ہیں خواہ کتنی عمر پائیں۔ کسی خاص خطہ میں محدود ہوتی ہیں خواہ ان کا دائرہ کتنا ہی پھیلا ہوا دکھائی دے۔ بدعت کے لیے قرآن وسنت اور اجماع وقیاس کی کوئی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی بجز اس کے کہ دلیل کے نام پر بے دلیل باتیں پیش کی جائیں۔

لیکن ہندوستان میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے ایک خاص ضد میں آکر طے کرلیا کہ بدعات کو مدون اور مدلل کرنا ہے۔ یہ شخصیت بریلی کے ایک ذہین مگر خود پرست عالم احمد رضا خان صاحب کی تھی۔ انھوں نے عقیدے کی ہر بدعت کو مدون بھی کیا اور قرآن وحدیث سے ان کے مدلل ہونے کا مغالطہ بھی دیا۔ نبی کریم ﷺ کے علمِ غیب کا عقیدہ، حاضر وناظر ہونے کا عقیدہ، کلی صاحبِ اختیار ہونے کا عقیدہ وغیرہ، یہ امور نہ مدون تھے نہ مدلل تھے۔ خان صاحب نے انھیں مرتب کیا، عقاید میں داخل کیا اور ہر ایک کے لیے دلیل فراہم کرنے کا دعوا کیا۔ حالاں کہ عقایدِ اسلام میں وہ سب قطعی نئی باتیں ہیں۔ اسی طرح بہت سے اعمال واقوال جو صراحتاً بدعت ہیں انھیں خود ساختہ دلایل سے ملمع کر کے دلیل بنانے کی کی کوشش کی۔ خان صاحب کا کمال یہی ہے انھوں نے منتشر اور مقامی یا ہنگامی بدعات کو فرضی دلایل کے چور دروازوں سے اسلام میں داخل کرنے کا نیا عمل جاری کیا اور اسی بنیاد پر اہلِ بدعت کو سمیٹ کر ایک مسلک بنایا اور اہلِ حق کے خلاف اتنے جذباتی نعرے لگائے کہ جو اہلِ بدعت تھے وہ اہلِ سنت ہونے کے مدعی بن گئے اور جو اہلِ سنت اور اہلِ حق تھے، ان پر کفر والحاد کے فتووں کی یلغار ہوگئی۔ چور کوتوال ہوگیا اور کوتوال اپنی صفائی دینے پر مجبور ہوگیا۔

خان صاحب نے اپنے مسلک کی ترویج واشاعت کے لیے فتووں کا انبار لگا دیا۔ اپنے شاگردوں کی ٹیم تیار کی اور اس کے لیے قرآن پاک کا ایسا ترجمہ بھی تحریر کیا جو قرآن کریم کی آیات کو ان کے مسلک کے مطابق کرسکے۔ خان صاحب اس ترجمے میں اس مصرعہ کے مصداق نظر آتے ہیں:

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

اس ترجمہ کو علماے اسلام نے قبول نہیں کیا۔ اس کے مقابلے میں اہلِ حق کے ترجمے

مقبول ہوئے تو بریلویوں نے اس ترجمے کے مناقب ومحاسن پر مضامین اور کتابیں لکھیں، مگر باطل کا نقش کبھی جمتا نہیں۔ علماے اہل حق نے حقیقت کھول کر رکھ دی۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی پیش نظر رسالہ ’’نزالہ مجدد‘‘ بھی ہے۔ اس میں مولانا اسرائیل صاحب قاسمی نے خان صاحب کے ترجمے کا تعاقب کیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ تعاقب خان صاحب کے والد گرامی مولانا نقی علی خان صاحب کی تحریرات کی روشنی میں کیا ہے۔ ایک دلچسپ کتاب ہے جس سے خان صاحب کے مبلغِ علم کی حقیقت کھلتی ہے۔ لب ولہجہ اس کتاب کا ذرا سخت ہے، مگر جس قوم سے مولانا کو سابقہ پڑا ہے وہ اس سے کم لب ولہجہ کو اپنی توہین سمجھتی ہے۔

بہار کے ایک خاص علاقے میں ایک پہاڑی قوم سنتھالیوں کی رہتی ہے۔ ان کا سر تیز استرے سے مونڈا جائے اور سر میں کہیں زخم نہ ہو تو وہ اس پر ناراض ہوتی ہے اور سر مونڈنے والے کو گالیاں دیتی ہے۔ بھتڑے چھُرے سے تواضع کی جائے تو خوش ہوتی ہے۔ یہی حال بریلویوں کا ہے، اگر اسے نرم ونازک الفاظ سے سمجھایا جائے تو طیش میں آجاتی ہے، اور اگر سخت اور گرم الفاظ سے تواضع کی جائے تو خوش ہوتی ہے۔ تو مولانا نے وہی اسلوب اختیار کیا ہے جس سے اس کے دماغ کے دریچے کھلیں۔ اللہ تعالی اس قوم کو سمجھ عطا فرمائیں۔

اس قوم کے عقاید واعمال قادیانی اور شیعوں کی طرح بالکل ہی ناقابلِ قبول ہیں، مگر اللہ کا قہر ہے کہ اس کو حق باطل محسوس ہوتا ہے اور باطل حق نظر آتا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ایک دعا منقول ہے۔ بریلویوں اور قادیانیوں اور شیعوں کے عقاید واعمال کے دیکھنے کے بعد اس دعا کی معنویت اور اہمیت منکشف ہوتی ہے۔ انھوں نے دعا کی ہے: اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقّاً وَارْزُقْنَا اِتِّبَاعَه وَاَرِنَاالْبَاطِلَ بَاطِلاً وَرْزُقْنَااِجْتِنَابَه. اے اللہ! ہم کو حق کو حق ہی دکھایئے اور اس کی پیروی کی توفیق عطا فرمایئے۔ اور جو باطل ہے اسے باطل ہی دکھایئے اور اس سے بچنے کی توفیق نصیب فرمایئے۔

کاش کہ بریلوی فرقہ کے لوگ خلوص دل کے ساتھ یہ دعا کرتے، شاید اللہ تعالی ان پر رحم فرما کر حقیقت واضح فرمادیتے۔

اعجاز احمد اعظمی

۶؍ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ

❑❑❑

مقدمہ

[مومن کامل: قرآن وحدیث کی روشنی میں]

الحمد للہ وحدہ والسلام علی من لا نبی بعدہ: اما بعد:

کہا جاتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے لیکن انسان کے اشرف ترین مخلوق ہونے کا معیار کیا ہے؟ انسانوں نے اپنے اپنے نظریات وخیالات کے لحاظ سے انسان کے اشرف اور کامل ہونے کے الگ الگ معیار مقرر کیے ہیں۔ لیکن یہ سارے معیارات انسانی وجود ہی کی طرح بودے اور ناپائیدار ہیں۔ اصل معیار وہ ہے جسے خالقِ انسان نے متعین کا ہے۔ وہی انسان کے ظاہر وباطن سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس کی نگاہ میں انسان کی ہر ہر صلاحیت اور ہر ہر کمزوری عیاں ہے: اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ. (ملک:۱۴) کیا وہی نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا۔ اور وہ باریک بیں، باخبر ہے۔

انسانیت کا یہ معیار اللہ تبارک وتعالی نے اپنی کتابِ مقدس میں بیان کیا۔ پھر اس کی تشریحات نبی اکرم ﷺ کی زبانِ حق ترجمان سے واضح فرمائی ہے۔ اور اس معیار پر کامل ومکمل شخصیت بطور نمونے کے خود رسول اللہ ﷺ کو بنایا اور سنوارا، اور ان کی تربیت میں ایک صالح معاشرہ کامل انسانوں پر مشتمل برپا کیا۔ اور اس معیاری انسان کا نام 'مومن' اور 'مسلم' رکھا۔ انسان کامل وہی ہے جو مومن ہے مسلم ہے۔ جس کے ایمان واسلام میں جس قدر کمی ہوگی اسی قدر وہ انسانیت سے گرا ہوا ہے۔

یہ ایک ایسا معیار ہے جس میں قیامت تک کوئی تبدیلی آنے والی نہیں ہے۔ دوسرے لاکھ چلاتے رہیں کہ انسانیت کا معیار یہ نہیں، وہ ہے، مگر سب غلط! معیار وہی ہے جسے اللہ نے عرشِ

الٰہی سے اتارا اور نبی کریم ﷺ نے اس کو پھیلایا اور اس کی بلندیوں تک آدمیوں کو پہنچایا۔

اب آدم کی اولاد کی ذمہ داری ہے کہ اس معیار کو تلاش کرے، اسے سمجھے، پھر اس پر اپنے آپ کو ڈھالے۔ خود نہیں ڈھال سکتا تو ڈھالنے والوں کی خدمت میں جائے اور خود کو ان کی اطاعت وانقیاد میں ڈال کر ان کے نقش قدم پر چلتا رہے۔ تو یہاں تین کام ہیں: تلاش کرنا، اسے اچھی طرح سے سمجھ لینا، پھر نفس کے تقاضوں کو ایک طرف کر کے اسی پیکر میں ڈھل جانا۔

اس معیار کی تلاش ہوگی قرآن کریم کی آیتوں میں، احادیث کے ذخیروں میں، نبی کریم ﷺ اور آپ کے تلامذہ حضرات صحابہ کرام کی سیرتوں میں، پھر ان کے سچے متبعین کے حالات و واقعات میں۔

اور اس کو صحیح طور سے سمجھنا ہوگا باعمل علما کی مجلسوں سے، ان کی تصانیف کے مطالعہ سے اور ان کی حکیمانہ باتوں سے۔ اور اس معیار پر اترنے کی مشق ومزاولت ہوگی بزرگوں اور مشائخ کی تربیت اور ان کے تزکیہ سے۔ یہ تینوں باتیں ضروری ہیں۔ بڑا خوش نصیب ہے وہ انسان جس کو یہ باتیں ایک ہی جگہ میسر آجائیں کہ ایک شخص قرآن وحدیث اور سیرتِ رسول اور سیرتِ صحابہ پر گہری اور وسیع نظر بھی رکھتا ہو اور اسے ان سب کی صحیح سمجھ بھی حاصل ہو اور وہ خود کسی صاحبِ تزکیہ کی صحبت میں رہ کر نفس وشیطان کی غلامی سے آزاد ہو چکا ہو اور اللہ کی اطاعت میں سرگرم ہو۔

جناب مولانا ضیاء الدین صاحب قاسمی ندوی خیرآبادی نے قرآن وحدیث میں انسانِ کامل یعنی مومنِ کامل کا معیار تلاش کیا اور اسے سلیقے سے ترتیب دے کر اختصار کے ساتھ زیرنظر کتاب میں جمع کر دیا ہے کہ تلاش کرنے والوں کو کُل تو نہیں لیکن بکثرت وہ باتیں مل جائیں جن سے متصف ہو کر ایک آدمی مومنِ کامل کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ کُل اس لیے نہیں کہ انسانی زندگی کے ابھی کئی پہلو ہیں جن پر اس مختصر کتاب میں گفتگو کی گنجایش نہیں ہے۔

تاہم میں مرتب موصوف کو متوجہ کرتا ہوں کہ انسانی زندگی کا ایک ناگزیر حصہ ہے عداوت، جنگ وجدال اور باہمی کشمکش۔ اس سے کسی آدمی کو مفر نہیں۔ ایک مومنِ کامل کشمکش کے میدان میں کس طرح گزرتا ہے، ایک الگ مضمون میں اسے بھی قدرے تفصیل سے لکھیں۔

بہر حال مرتبِ محترم نے معیار کو تلاش بھی کیا اور اسے بہتر انداز میں سمجھایا بھی۔

مسلمانوں کے لیے یہ کتاب ایک بہتر رہنما ہے، اسی کے ساتھ وہ لوگ جو اسلام سے بدگمان ہیں، ان کا بھی اس میں علاج ہے۔ ایسے لوگ ٹھنڈے دل سے اسے پڑھیں اور سمجھنے کی کوشش کریں تو اسلام اپنی اصلی صورت میں جلوہ گر نظر آئے گا اور غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی۔

اس کتاب کو ہندی زبان میں بھی شایع کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اس ملک میں مسلمانوں کا ایک خاصہ طبقہ اردو سے بے گانہ ہے۔ وہ ہندی زبان پڑھتا ہے اور سمجھتا ہے۔ اس سے اس کی افادیت عام ہوگی۔

حق تعالی مرتب موصوف کو مزید توفیق عطا فرمائیں کہ وہ قلم اور زبان سے دین کی خدمت کرتے رہیں۔ اللہ تعالی اپنے فضل سے قبول فرمائیں۔

اعجاز احمد اعظمی
۹؍شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ چہار شنبہ

* * *

سخن ہائے گفتنی

[دینِ فطرت]

الحمدلله رب العالمین و الصلاۃ و السلام علی سید المرسلین و آله الطیبین و الطاهرین و صحبه اجمعین.

اسلام دینِ فطرت ہے۔ دینِ فطرت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا کوئی حکم، اسلام کا کوئی قانون، اسلام کا کوئی امر، اسلام کی کوئی نہی فطرتِ انسانی کے تقاضوں اور ضروریات و لوازم سے منحرف اور اس کے خلاف نہیں ہے۔ انسان اپنی فطرت میں آزاد اور بے لگام نہیں پیدا ہوا ہے۔ اس کی فطرت اپنے صحیح رخ پر اسی وقت ہوگی اور اس میں آراستگی اور خوبصورتی اسی وقت پیدا ہوگی جب اسے مناسب احکام اور موزوں قیود وضوابط کا پابند کیا جائے۔ ورنہ اگر اسے آزاد اور بے قید چھوڑ دیا جائے تو اس میں اور صرف کھانے پینے والے بہائم میں بلکہ اس میں اور سرکش شیاطین میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے انسان کی بے قید خواہشوں اور نفسِ اَمّارہ کے تقاضوں پر روک لگائی ہے۔ انھیں گناہ قرار دے کر حرام کر دیا ہے۔ فطرت سے بغاوت کرنے والا ایسے احکام پر معترض ہوتا ہے کہ اسلام نفس کے تقاضوں پر پابندی لگاتا ہے، خواہشوں سے منع کرتا ہے، مگر فطرت شناسوں کو بخوبی معلوم ہے کہ نفس کے تقاضے ہوں یا معاصی کی لذتیں ہوں، یہ فطرتِ انسانی کے تقاضے اور لوازم نہیں ہیں، بلکہ یہ طبیعتِ انسانی یا دوسرے لفظوں میں نفس کی کمزوریاں ہیں اور فطرت سے بغاوت ہے۔ اگر ان پر پابندی نہ لگائی جائیں اور طبیعت کی کمزوریوں کو مطلق العنان چھوڑ دیا جائے تو انسانی زندگی اور معاشرت کا سارا نظام تہ وبالا ہو جائے۔

اسلامی تعلیمات کے لیے دو بنیادیں ہیں: ایک قرآن کریم اور دوسری سنت رسول۔ ان کے بعد ان دونوں میں عقلِ انسانی سے غور وتدبر کا ایک درجہ ہے۔ عقلِ انسانی معصوم نہیں ہے، اس لیے ان حدود کا پابند ہونا ضروری ہے جنھیں قرآن وسنت نے متعین کیا ہے۔ اس کا رخ اسی وقت صحیح سمت میں ہوگا جب اس کی رہبری قرآن وسنت کی روشنی میں ہو۔ ایسی عقل جب کسی حکم کو قرآن وسنت سے اخذ کرتی ہے اور اس پر اس جیسی تمام عقول کا اتفاق ہو جاتا ہے تو اسلامی اصطلاح میں 'اجماع' کہتے ہیں ورنہ وہ 'قیاس واجتہاد' ہے۔

شریعتِ اسلامی کے تمام احکام اور تمام اوامر ونواہی انھیں چاروں بنیاد پر علی الترتیب مبنی ہیں۔ ان سے جو مسائل واحکام مستنبط کیے گئے ہیں ان کا مقدس نام 'فقہِ اسلامی' ہے۔ اور ان کی معرفت رکھنے والا، ان پر گہری نظر رکھنے والا 'فقیہ' کہلاتا ہے۔

فقہِ اسلامی کی تشریح وترجمانی پر علماے اسلام اور فقہاے عظام نے ہر دور میں اور ہر جگہ اتنی توجہ دی ہے اور اتنا اہتمام کیا ہے کہ اس کا ایک عظیم الشان کتب خانہ تیار ہو گیا ہے۔ اسلام کی اصل زبان تو عربی ہے، اسی لیے فقہِ اسلامی کا سب بڑا ذخیرہ عربی زبان میں ہے۔ عربی کے بعد اگر کسی زبان کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ اردو ہے۔ اردو زبان گو کہ بہت قدیم زبان نہیں ہے مگر اردو جاننے والے علما نے فقہ وفتاوی کے اتنے عظیم مجموعے سے اس زبان کو مالا مال کر دیا ہے کہ دوسری زبان میں عربی کے بعد شاید اس کی نظیر نہ ملے۔

اسلام کے ماننے والوں نے زندگی کے ہر گوشے اور ہر مرحلے میں ان احکام سے رہنمائی چاہی ہے۔ قرآن نے انھیں تاکید کی ہے کہ: فَاسْأَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. (انبیاء:۷) اگر تمھیں علم نہ ہو تو جاننے والوں سے پوچھ لیا کرو۔

اس حکم کی تعمیل میں اہل اسلام نے ہر زمانے میں اور جہاں جہاں ان کی آبادیاں رہی ہیں یا ہیں...... اور دنیا میں کون سی جگہ ہے جہاں اسلام نہیں ہے اور اہل اسلام نہیں...... انھوں نے اپنے علما وفقہا سے تحریراً وتقریراً مسائل پوچھے ہیں، مشکلات کا حل دریافت کیا ہے۔ جہاں کوئی پیچیدگی پڑی ہے اس گتھی کا سلجھاؤ ان علما سے چاہا ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے علما نے اہتمام کیا کہ جو سوال تحریری طور ہوں ان کے جواب بھی تحریر میں لائے جائیں۔ پھر انھیں محفوظ رکھنے کا

اہتمام کیا گیا اور انھیں ایک ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے شایع کر دیا۔ اس طریقہ عمل سے آج ہمارے ہاتھوں میں فتاوی کا ایک عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے۔

دارالعلوم دیوبند ۱۸۶۶ء میں قایم کیا گیا۔ وہاں سے روزِ اول سے فتاوی ومسائل کے جمع وتدوین کا اہتمام رہا۔ آج ’فتاوی دارالعلوم‘ کے نام سے مسائل واحکام کا ایک معتبر مجموعہ امت اسلامیہ کے ہاتھوں میں ہے۔ پھر دیوبند کے آفتاب سے ملک بھر میں جو بہت سے چاند ستارے جگمگائے، وہاں احکام ومسائل کی روشنی پھیلی۔ پھر انفرادی طور سے بہت سے علما وفقہا کی کاوشیں منظرِ عام پر آئیں۔ اس کی فہرست بہت طویل ہے، اہلِ نظر ان سے واقف ہیں۔

اس طویل فہرست میں زمانہ حال کے ایک معتبر ممتاز فقیہ ومفتی خاکسار راقم الحروف کے رفیقِ درس اور ہمدم دیرینہ مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب فتح پوری کا نام بھی آتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں ان کی رفاقت کا شرف مجھے حاصل رہا۔ طالب علمی کے دور میں بہت ذہین وفطین سعادت مند اور بے حد محنتی طالب علموں میں ان کا شمار تھا۔ حافظہ بہت قوی تھا، استعداد نہایت پختہ، علم کے دھنی، عزیمت میں استوار، اساتذہ کی نگاہوں میں محبوب ومقبول تھے۔

رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد اللہ کی دست گیری نے انھیں ہندوستان کے سب سے بڑے شہر ممبئی میں پہنچا دیا۔ یہاں ایک قدیم ادارہ ’مدرسہ امدادیہ‘ ہے، اس میں تدریس وافتا کے منصب پر فائز ہوئے۔ طلبہ کو علم دین کے لیے تیار کرتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ مسائل واحکام کے متعلق سوالات کے جوابات دیتے رہے۔

ممبئی کے مسلمان جہاں مال ودولت اور تجارت وحرفت میں ممتاز ہیں، ان میں اپنے مسائل ومعلومات کا بھی جذبہ بہت ہے۔ مدرسہ امدادیہ کے دارالافتا میں ان کے فتاوی کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر بہت محنت کی، صحت کی خرابی کے باوجود جی جان سے اس فریضہ کی ادائیگی میں لگے رہے۔ اس کا ثمرہ ہے کہ آج مہاراشٹر کے بڑے اصحابِ فتاوی میں ان کا نام ممتاز ہے۔

ممبئی سے شایع ہونے والے روزنامہ ’انقلاب‘ کے جمعہ ایڈیشن (جمعہ کی اشاعت) نے ان کے فتاوی کی خدمت حاصل کی۔ ۱۹۸۵ء سے ان کے فتاوی ’دینِ فطرت: آپ ک مسائل اور

ان کا حل‘ کے نام سے مسلسل شایع ہونے شروع ہوئے جن سے عوام وخواص کو بہت فایدہ حاصل ہوا اور مفتی صاحب کی عظمت بھی بڑھتی رہی۔

یہ فتاوی جو انقلاب میں شایع ہوتے رہے، ان کا ایک مجموعہ مرتب ہوکر مسلمانوں کی خدمت کے لیے منظر عام پر آرہا ہے۔ ان میں زندگی کے کتنے مشکلات کا حل موجود ہے، پڑھنے کے بعد اہلِ نظر کو معلوم ہوگا۔

حق تعالی سے دعا ہے کہ مفتی صاحب کو زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق حاصل ہو اور ان کا ذہن وقلم ہمیشہ صراط مستقیم پر گامزن رہے اور مسلمانوں کو ان سے اور ان کے فتاوی سے مستفید ہونے کی توفیق ہو۔ آمین یارب العالمین

اعجاز احمد اعظمی

۱۴/ربیع الآخر ۱۴۳۴ھ/۲۶/فروری ۲۰۱۳ء

❑❑❑

فہرستِ تالیفات، مکتوبات، خطبات، رسائل وتراجم
مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ

تالیفات:

۱۔ حیاتِ مصلح الامت [حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اعظمی کی مفصل سوانح]
۲۔ حیاتِ سراج الامت [سراج الامت حضرت مولانا سراج احمد صاحب امروہوی کی سوانح حیات]
۳۔ تذکرہ شیخ ہالیجوی [سندھ کے معروف شیخ طریقت وعالم حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجوی کا مفصل تذکرہ]
۴۔ ذکرِ جامی [ترجمانِ مصلح الامتؒ مولانا عبدالرحمان جامی کے حالاتِ زندگی]
۵۔ حضرت چاند شاہ صاحب اور ان کا خانوادۂ تصوف [حضرت چاند شاہ صاحب ٹانڈوی اور ان کے خلفا کے حالات]
۶۔ تذکرہ مولانا عبدالقیوم فتح پوری
۷۔ حکایتِ ہستی حصہ اول [خودنوشت سوانح، ابتدائے حیات سے اختتامِ طالب علمی تک]
۸۔ تہجد گزار بندے [تہجد کی اہمیت وفضیلت اور تہجد گزار بندوں کا تفصیلی تذکرہ]
۹۔ ......کھوئے ہوؤں کی جستجو [مختلف شخصیات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ]
۱۰۔ نمونے کے انسان [بزرگان دین کے واقعات وحکایات کا مجموعہ]
۱۱۔ مدارسِ اسلامیہ: مشورے اور گزارشیں [مدارس سے متعلق مضامین کا مجموعہ]
۱۲۔ کاروانِ حرم [حضرت سید احمد شہید کے سفر حج کی داستان مع مختصر سوانح]

۱۳۔ بطوافِ کعبہ رفتم .... [سفر نامۂ حج] حرمین شریفین کے سفر کی روداد

۱۴۔ حدیث دردِ دل [مجلّہ المآثر و ماہنامہ ضیاءالاسلام کے اداریوں کا مجموعہ]

۱۵۔ علوم و نکات [مجموعہ مضامین]

۱۶۔ تصوف: ایک تعارف

۱۷۔ حج و عمرہ کے بعض مسائل میں غلو اور اس کی اصلاح

۱۸۔ مسئلہ ایصال ثواب: ایک ذہنی طغیان کا احتساب

۱۹۔ نگارشاتِ اعجاز [مولانا اعظمی کی بعض کم یاب اور غیر مطبوعہ تحریریں]

مکاتیب:

۲۰۔ حدیثِ دوستاں [دینی و اصلاحی اور علمی و ادبی مکاتیب کا مجموعہ]

۲۱۔ اعجاز نامے [دینی، تربیتی، اصلاحی، علمی و ادبی مکاتیب کا مجموعہ]

شرح:

۲۲۔ تسہیل الجلالین شرح اردو جلالین شریف [جلد اول]

۲۳۔ تسہیل المیبذی

خطبات:

۲۴۔ خطبات اعجاز [دینی و اصلاحی خطبات و بیانات]

(جلد اول مطبوعہ۔ جلد دوم زیر عمل)

رسائل:

۲۵۔ قتل ناحق قرآن و حدیث کی روشنی میں

۲۶۔ تعویذات و عملیات کی حقیقت و شرعی حیثیت

۲۷۔ شب برأت کی شرعی حیثیت

۲۸۔ فتنوں کی طغیانی [ٹی وی پر ایک فکر انگیز تحریر]

۲۹۔ اہل حق اور اہل باطل کی شناخت

۳۰۔ مالی معاملات کی کمزوریاں اوران کی اصلاح

۳۱۔ منصبِ تدریس اورحضرات مدرسین

۳۲۔ خواب کی شرعی حیثیت

۳۳۔ تکبراوراس کا انجام

۳۴۔ **المد التعظیمی لاسم الجلالة**: اذان میں لفظِ اللہ پر مد کرنے کی تحقیق

۳۵۔ اذ کارسلسلہ قادریہ

۳۶۔ رمضان المبارک: نیکیوں کا موسم بہار

۳۷۔ مروجہ جلسے: بےاعتدالیاں اوران کی اصلاح

تلخیص وتراجم:

۳۸۔ مودودی صاحب اپنے افکارونظریات کے آئینہ میں [مولانا بنوری کی عربی کتاب الاستاذ المودودی کا ترجمہ]

۳۹۔ کثرتِ عبادت عزیمت یا بدعت؟

۴۰۔ اخلاق العلما [علما کے لیے خاص چیز]

۴۱۔ دین داری کے دودشمن [حرصِ مال وحبِ جاہ پر ایک تحریر]

۴۲۔ برکاتِ زمزم [ماے زمزم کی فضیلت واہمیت کا بیان]

مرتب کردہ کتب:

۴۳۔ تالیفات مصلح الامت جلد پنجم [مطبوعہ] جلد ششم [غیر مطبوعہ]

۴۴۔ درد ودرماں [حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے ان مضامین کا انتخاب اور ترتیب جو مصائب وغیرہ کے اسباب اوران کے حل پر مشتمل ہے]

۴۵۔ محبت الٰہی اور نفس [حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی چند مجالس کا مجموعہ، اور ان پر عناوین کی ترتیب]

۴۶۔ احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن [حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کے طویل سلسلۂ مضامین کی کتابی ترتیب]

سراپا اعجاز

حیات و خدمات

عارف باللہ
حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ
(آمد: ۵؍فروری ۱۹۵۱ء وفات: ۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء)
(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو یوپی)

ترتیب
محمد عرفات اعجاز اعظمی

ناشر
مدرسہ سراج العلوم سراج نگر، چھپرا
چریاکوٹ، ضلع مئو، یوپی - پن: 276129
موبائل نمبر: 9450732959